اشفاق احمد

شخصیت اور فن

عالمی اردو ادب ۲۰۰۶ء

مدیر: نند کشور وکرم

عالمی اُردو ادب

اشفاق احمد نمبر

مدیر

نند کشور وکرم

جلد: ۲۴ ۲۰۰۶ء قیمت: ۲۵۰روپے

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز کرشن نگر دھلی

ISBN 81-88298-02-6

عالمی اُردو ادب ۲۰۰۶

(اشفاق احمد نمبر)

عالمی اُردو ادب

ایف 14/21 (ڈی) کرشن نگر دہلی-110051

فون: 11=22094419

ای میل: nandkishorevikram

بیرون ملک میں عالمی اُردو ادب کی دستیابی کے رابطے:

امریکہ: جناب ظفر ملک (فون: 718-372-1044)

2074 20th Lane, *3C Brooklyn NewYork USA*-11214

برطانیہ: جناب جتندر بلو (فون: 0044-2089980185)

6.Corfton,Lodge,Corfton Road,Ealing London,(UK)W52 HU

کینیڈا: ڈاکٹر بیدار بخت (فون: 416-292-4391)

21-Whiteleaf,Scarborough,Ont.,Canada, MIV 3G1

Alami Urdu Adab

F-14/21(D) Krishan Nagar, Delhi-110051.

ترتیب

شخص اور شخصیت

چند تخلیقات

افسانے

چند تحریریں

نظرِ دیگراں

خراجِ عقیدت

☆☆☆☆☆

اشفاق احمد عالمِ پیری میں

بانو قدسیہ کے ساتھ

آخری دنوں میں بانو قدسیہ کے ساتھ

پیش لفظ

''عالمی اُردو ادب'' کا اشفاق احمد پر خصوصی شمارہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔

اشفاق احمد پاکستان کے مقبول ترین اور معروف افسانہ نگار تھے۔ اُن کے وفات سے اُردو ادب اپنے ایک عظیم ''داستان گو'' سے محروم ہو گیا ہے جس نے متعدد افسانوں کے علاوہ بے شمار ڈرامے بھی پیش کئے۔

ہندوستان میں اشفاق احمد زیادہ تر اپنی زندہ جاوید کہانی ''گڈریا'' کی وجہ سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کے بعد اشفاق کی تحریریں کبھی کبھار ہی ہندوستانی اخبارات میں نظر سے گزریں اور نہ ہی انہوں نے کبھی ہندوستانی سماج کی جانب توجہ دی۔ اُن کی ساری توجہ بعض پاکستانی دانشوروں کی طرح ''اسلام'' اور ''پاکستانیت'' تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ وہ صرف پاکستانی اُردو ادیب بن کر رہ گئے۔ اور اُن کی ادبی کاوشیں فیض احمد فیض اور انتظار حسین وغیرہ کی طرح ملکی سرحد پار کر کے ہندوستان تک نہ پہنچ سکیں۔

''عالمی اُردو ادب'' ایک حوالہ جاتی مجلہ ہے اور اس میں کسی خاص گروپ یا کسی خاص نظریے کا نہیں بلکہ ہر اُردو ادیب و شاعر سے متعلق حوالہ جاتی مواد پیش کیا جاتا ہے جو مستقبل میں اُردو محققین کے کام آئے، اور ہم باری باری ہندوستان اور پاکستان کی بنا امتیاز و تفریق اہم ادبی شخصیات پر نمبر پیش کرتے رہے ہیں۔ ہم کبھی نہیں دیکھتے کہ وہ ترقی پسند ہے یا جدیدیت پسند۔ ہم یہ بھی بھی مدِ نظر نہیں رکھتے کہ اُس کے نظریات کیا ہیں۔ اس سے پہلے ہم نے حبیب جالب، دیویندر اسر، احمد ندیم قاسمی، علی سردار جعفری پر خصوصی نمبر شائع کئے اور اب ہمارا پاکستان کے کسی ادیب یا شاعر پر خصوصی نمبر شائع کرنے کا پروگرام تھا۔ پہلے ہم نے مشہور افسانہ نگار انتظار

حسین پر نمبر نکالنے کا پروگرام بنایا تھا لیکن بعد میں ہم نے یہ ارادہ ترک کر دیا کیونکہ انتظار حسین پر ہندوستان میں اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے جتنا شاید پاکستان میں بھی نہیں۔ لہذا ہم نے اشفاق احمد صاحب کا انتخاب کیا تاکہ ہندوستان کے اُردو قارئین بھی اُن کی ادبی خدمات سے روشناس ہو سکیں کیونکہ ہندوستان میں اُن کے بارے میں بہت کم ہی لکھا گیا ہے۔

یہ سچائی ہے کہ ہم اشفاق احمد کے بعض نظریات سے اتفاق نہیں کرتے خصوصاً ہندوستان اور بعض ہندوستانی رہنماؤں سے متعلق اُن کے نظریات سے۔ اور نہ ہم انہیں صوفی مانتے ہیں۔ وہ صرف اُردو کے ایک ممتاز و نامور افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار تھے۔ صوفی تو مولانا روم، بلہے شاہ، کبیر ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جو مذہب سے بالاتر ہوتی ہیں اور جن کا مذہب صرف انسانیت ہوتا ہے۔

اشفاق احمد کی ایک متنازعہ فیہ شخصیت ہونے کے باوجود ہم ان سے متعلق یہ خصوصی شمارہ پیش کر رہے ہیں تاکہ ہندوستان میں اُردو کے پرستار جو انہیں ''گڈریا'' کے خالق کی حیثیت سے کبھی فراموش نہیں کر پائے اور جن کی یہ کہانی اُردو کے علاوہ اور بھی کئی ہندوستانی زبانوں میں چھپ چکی ہے، اُن کی دیگر تخلیقات اور اُن کی شخصیت اور فن سے متعلق بھی روشناس ہو سکیں۔ کیونکہ وہ ایک ممتاز افسانہ نگار تھے اور ڈرامہ نویسی کے میدان میں بھی انہوں نے اتنی شہرت پائی تھی کہ آج پاکستان میں اُن کے ہزروں نہیں لاکھوں پرستار ہیں اور جنہیں اپنی بعض تخلیقات کی بنا پر اُردو ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

نند کشور وکرم

☆☆☆☆☆

اشفاق احمد...... ایک نظر میں

سوانحی اشارے

نام: اشفاق احمد خاں

ولادت: ۲۲ راگست ۱۹۲۵ء بمقام مکیسر فیروز پور (پنجاب)

تعلیم: ۱۹۵۰ء میں ایم اے (اُردو) گورنمنٹ کالج لاہور سے، ۱۹۵۳ء میں اطالوی زبان میں ڈپلومہ روم یونیورسٹی روم (اٹلی) سے اور فرانسیسی میں ڈپلومہ گرینوبل یونیورسٹی پیرس فرانس سے، ۱۹۶۲ء میں براڈ کاسٹنگ کی خصوصی ٹریننگ نیویارک یونیورسٹی امریکہ سے اور اسی سال بریڈ لائف رائٹرز ورکشاپ ورماؤنٹ میں شمولیت۔

مختصر احوال: بچپن اور لڑکپن فیروز پور میں گزرا۔ تقسیم ملک کے بعد اپنے والدین کے ساتھ ہجرت کر کے لاہور چلے گئے اور کچھ مدت مزنگ روڈ میں مقیم رہے۔ معاشی حالات اچھے نہ ہونے کے کارن ملازمت کے لئے دفتر روزگار گئے مگر گریجویٹ ہونے کی وجہ سے ملازمت نہ مل سکی۔ پھر دوسرے دن میٹرک کا سرٹیفکیٹ دکھا کر ریلوے میں ملازمت اختیار کی مگر وہاں ایک دن سے زیادہ ملازمت نہ کی اور بعد ازاں مہاجرین کے والٹن میں واقع کیمپ میں ملازم ہو گئے۔ ایک دن سودی خانہ میں گزارا اور پھر اناؤنسمنٹ کے شعبے میں منتقل ہو گئے۔ ۵۲-۱۹۵۱ء میں دیال سنگھ کالج لاہور میں اُردو کے لیکچرار، ۵۴-۱۹۵۲ء میں روم یونیورسٹی میں اُردو لیکچرار، ۵۹-۱۹۵۷ء میں "داستان گو" لاہور کے ناشر، ۶۴-۱۹۶۳ میں ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور کے مدیر، ۱۹۶۷ میں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پنجابی کے اعزازی

لیکچرار۔ پھر بحیثیت ڈائرکٹر آر سی ڈی ریجنل کلچرل انسٹی ٹیوٹ پاکستان برانچ میں مامور اور ۹۰۔۱۹۶۵ء میں ڈائرکٹر جنرل اُردو سائنس بورڈ لاہور کے عہدے پر فائز رہے۔

اولین افسانہ: توبہ۔ مطبوعہ ماہنامہ ادبی دنیا لاہور ۱۹۴۲ء

ازدواجی زندگی: ۱۹۵۶ء میں بانو قدسیہ سے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کی۔

مطبوعات:

افسانے: **ایک محبت سو افسانے** (۱۳ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز لاہور ۱۹۵۱ء

(۱۔ توبہ ۲۔ فہیم ۳۔ رات بیت رہی ہے، ۴۔ تلاش، ۵۔ سنگ دل، ۶۔ مسکن ۷۔ شب خون، ۸۔ توتا کہانی ۔ ۹۔ عجیب بادشاہ ۔ ۱۰۔ بندرابن کی کنج گلی میں، ۱۲۔ پناہیں، ۱۳۔ امی۔)

اُجلے پھول (۸ افسانے اور ایک رپورتاژ) بک لینڈ لاہور، فروری ۱۹۵۷

(۱۔ اُجلے پھول، ۲۔ گُل ثریا، ۳۔ تنکہ، ۴۔ حقیقتِ نیوش، ۵۔ توشے بلے، ۶۔ صفدر ٹھیلہ ۷۔ گنڈریا، ۸۔ برکھا، ۹۔ 'ایل ویرا' (روم سے متعلق رپورتاژ)

سفر مینا (گیارہ افسانے) سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، اپریل ۱۹۸۳ء

(۱۔ اٹوٹ مان، ۲۔ قاتل، ۳۔ قصہ نل دمینتی، ۴، چور، ۵۔ مانوس اجنبی، ۶۔ بیا جاناں، ۷۔ محسن محلّہ، ۸۔ پانچ میل دور، ۹۔ کالج سے گھر تک، ۱۰۔ گاتو، ۱۱۔ فُل برائٹ)

مذکورہ بالا تین مجموعوں میں شائع ۳۲ افسانوں کے علاوہ ان کے کئی افسانے کسی مجموعے میں شامل نہیں مثلاً ۱۔ ''گھر تائیاں اور گھروندے'' مطبوعہ ادبِ لطیف، مئی ۲۰۰۵ء، ۲۔ ماسٹر روشی مشمولہ ۱۹۷۱ء کے منتخب افسانے، ۳۔ ''سوئی'' مطبوعہ ادب لطیف لاہور شمارہ ۳۔۴ اور ۴۔ ''بندر لوگ'' مطبوعہ نیا دور کراچی افسانہ نمبر۔

مزاحیہ: ۱۔قمر کار ۲۔گرما گرم

دیگر ۱۔نہفت زبانی لغات،۲۔ایک ہی بولی،سمجھانے افسانے،،بابا صاحبا، طلسم ہوش افزا وغیرہ

ناولٹ: ۱۔'مہمانِ بہار' مکتبہ میری لائبریری، لاہور۱۹۵۵۔(اب 'سفر مینا' میں بھی شامل ہے) ۲۔کھیل تماشہ

تراجم: ۱۔'وداعِ جنگ' ارنسٹ ہیمنگوے کی تخلیق A Farewell to Arms کا انگریزی سے ترجمہ،ناشر ملک دین محمد،یونائیٹڈ بُک ڈپو،لاہور جنوری ۱۹۶۰

۲۔رتاشی کے انگریزی ناول The Golden Hawks of Genghis کا اُردو ترجمہ ''چنگیز خاں کے سنہری شاہین'' ناشر مکتبہ معین الادب لاہور بہ اشتراک موسسہ فرینکلن نیویارک ۱۹۶۰ء

۳۔ہیلن شیکو کی مشہور کتاب Getting along with others کا ''دوسروں سے نباہ'' کے عنوان سے ترجمہ۔ناشر گوشۂ ادب لاہور۔

ٹی وی ڈرامے: ۱۔ایک محبت سو ڈرامے(۱۹۸۸) ۲۔قلعہ کہانی(۱۹۹۰ء) ۳۔ننگے پاؤں (۱۹۹۱ء) ۴۔اور ڈرامے(۱۹۹۳ء) ۵۔حیرت کدہ(۱۹۹۵ء) ۶۔توتا کہانی (۱۹۹۸ء) ۷۔بند گلی۔۸۔شاہلا کوٹ،۹۔مہمان سرائے،۱۰۔من چلے کا سودا تلقین شاہ۔(۱۔گلدان ۲۔جنگ بجنگ،۳۔حسرتِ تعمیر،۴۔دھینگا مشتی، ۵۔ڈھنڈورا۔۶۔شوراشوری(ان ڈراموں کا ناشر سنگِ میل لاہور ہے)

زاویہ: ناشر:ٹی اینڈ ٹی پبلشرز لاہور

ریڈیو پروگرام: ۲۹ سہ فیچرز،خاکے،اور مختصر ڈرامے،۴۸ طویل دورانیے کے کھیل، تلقین شاہ کے رائٹر،پروڈیوسر اور کیرکٹر ایکٹر۔(یہ مشہور ڈرامہ ۴۱ سال تک پاکستان کے تمام ریڈیو اسٹیشنوں سے نشر ہوتا رہا)'زاویہ' کے ۹۰ پروگرام پاکستان ٹی وی سے ۲۱راکتوبر تا ۱۴رفروری ۲۰۰۴ء نیلی کاسٹ۔

پنجابی: ڈرامے: ٹاہلی تھلے (۱۹۹۰ء) ۲۔اُچے بُرج لہور دے (ناشر سنگ میل لاہور)

شاعری: کھٹیاوٹیا، ناشر سنگِ میل لاہور۔

فلم: فیچر فلم ''دھوپ اور سائے'' ہدایت کار اور رائٹر

سفرنامہ: سفر در سفر

غیر ملکی سفر: برطانیہ، فرانس، امریکہ، جرمنی، آسٹریا، ڈنمارک، ناروے، کینیڈا، مصر، اسپین، اٹلی، بیلجیم، ہالینڈ، لبنان، ایران، چین، ترکی، سعودیہ

ایوارڈ: ۱۔پرائیڈ آف پرفارمنس حکومتِ پاکستان کا اعلیٰ ترین ایوارڈ ۲۔دوہا قطر ایوارڈ ۳۔ستارہ امتیاز

اہم حیثیتیں: رُکن انسٹی ٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز اسلام آباد یونیورسٹی۔

رُکن پاکستان کورسز کمیٹی بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، لاہور

رُکن تعلیم بالغان سوسائٹی گوجرانوالہ

رُکن اکادمی ادبیات پاکستان (مرکزی باڈی) اسلام آباد (پاکستان)

رکن بورڈ آف اسٹڈیز (پنجابی) پنجاب یونیورسٹی لاہور۔

رُکن ترقی اُردو بورڈ، کراچی۔

رکن نیشنل کونسل آف دی آرٹس، اسلام آباد۔

رُکن ہجرہ کمیٹی اسلام آباد، پاکستان

رُکن (مرکزی کمیٹی برائے پاکستان) برکلے اُردو پروگرام برکلے یونیورسٹی

مدیر اعلیٰ (اعزازی) ماہنامہ ''سکھی گھر'' لاہور۔

وفات: ۷ر ستمبر ۲۰۰۴ء لاہور (پاکستان)

☆☆☆

افضال ریحان

ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

آپ نے پہلا افسانہ کب لکھا؟

میں نے 1942ء میں پہلا افسانہ لکھا تھا اس کا نام ''توبہ'' تھا اور وہ ''ادبی دنیا'' میں چھپا۔ مولانا صلاح الدین نے اپنے ایڈیٹوریل میں اس کی بڑی تعریف کی۔ میں چھوٹا سا آدمی تھا۔ لیکن اس سے مجھے بڑا حوصلہ ہوا۔

اس زمانے میں آپ کا سیاسی شعور کیسا تھا؟

اس زمانے میں ہماری ایک بہت طاقت ور جماعت تھی۔ ''ترقی پسند تحریک'' وہ کسی بندے کو بندہ ہی نہیں سمجھتی تھی۔ جو اس کے اصولوں سے مطابقت نہ رکھتے ہوں ایسے لوگوں کو چاہے وہ کیسے ہی ادیب ہوں کان سے پکڑ کر نکال دیتی تھی کہ یہ تو ادیب ہی نہیں ہے۔ جیسے ممتاز مفتی کے ساتھ ہوا' قدرت اللہ صاحب تھے' نسیم حجازی تھے۔

پاکستان بننے کے ساتھ ہم چند لڑکے پوری طاقت کے ساتھ نکلے جن میں انتظار حسین' اے حمید اور استاد دامن بھی تھے' اے حمید کی دوستی تو امرتسر کے کچھ ترقی پسند دوستوں کے ساتھ تھی لیکن ان کی تحریر میں وہ ساری باتیں نہیں آتی تھیں جو ترقی پسند تحریک کا تقاضا تھیں۔ یہی معاملہ انتظار حسین کے ساتھ اور خود میرے ساتھ بھی تھا۔

ہماری سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہم اپنی طاقت کے زور پر چلے۔

اپنی بال کے بیکی؟

بالکل آپ نے صحیح الفاظ چنے' ہم نے اپنی بال کے بیکی' اپنے قارئین پیدا کر کے' اپنی زندگی کی شمعیں جلا کر روشنی کی۔ یہ بڑا ہی مشکل کام تھا۔ اس وجہ سے وہ ہمیں پسند نہیں کرتے تھے' منہ نہیں لگاتے تھے کہ یہ نالائق روایت کے مارے ہوئے ہیں لیکن قارئین نے ہمیں جس

طرح سراپا اس مہربانی سے ہم زندہ رہے۔

آپ اپنی زندگی کا سفر ریڈیو پاکستان کے حوالے سے بتایئے؟

میرا ایم اے کا رزلٹ ابھی نہیں آیا تھا کہ ہمارے ساتھی ممتاز مفتی، یوسف ظفر یہاں آئے اور کہا کہ ہم تو آج کل آزاد کشمیر ریڈیو میں کام کرتے ہیں اور انڈیا کے پراپیگنڈے کا توڑ کرتے ہیں، ہمارے اسٹیشن ڈائریکٹر محمود نظامی بھی یہاں آئے ہوئے ہیں تم بھی ان سے ملو۔

ہم شام کو انہیں ملے تو انہوں نے کہا چھوڑو یہاں جو بھی کر رہے ہو چلو ہمارے پاس وہ مجھے وہاں لے گئے تین سو روپے مہینہ، بڑا اچھا ماحول، بڑے اچھے دوست، مسعود قریشی، وقار صدیقی، عمر، یہ پڑھے لکھے لوگ تھے سو ان کے ساتھ میں نے بھی وہاں کام شروع کر دیا۔

پروفیسر عابد علی عابد دیال سنگھ کالج کے پرنسپل تھے وہ وہاں کسی ٹاک کے سلسلے میں گئے میرا ایم اے اُردو کا رزلٹ آ چکا تھا، انہوں نے مجھے دیکھا تو بولے ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ ہمیں اُردو کے لوگ نہیں مل رہے۔'' میں نے کہا ''جی یہاں بہت اچھا ہے۔'' کہنے لگے ''نہیں غلط بات ہے، تم ایک استاد ہو چلو ہمارے ساتھ'' اس طرح یہاں لاہور آ کر دیال سنگھ کالج پڑھانا شروع کر دیا۔ میاں ریحان یہ عجیب اتفاق ہے کہ میں نے ساری زندگی کبھی کسی نوکری کے لیے عرضی نہیں دی۔

اس کے باوجود بائیسویں گریڈ میں بھی پہنچ گئے؟

یہ اللہ کے کام ہیں آپ دیکھ لیں۔ یہاں آیا تو بڑے بڑے نابغہ روزگار لوگ سٹاف روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انجم رومانی موجود تھے۔ یہاں آ کر پڑھائی کی طرف مزید رخ بدلا انگریزی کی طرف بھی رجحان ہوا۔ لائبریری، دیال سنگھ کی بہت اچھی تھی۔

اس طرح ڈیڑھ سال گزر گیا تو اس دوران اٹلی حکومت نے ہماری گورنمنٹ کو لکھا کہ ہم روم میں یونیورسٹی کے لیے اردو کا استاد چاہتے ہیں جو ساتھ ہی ہمارے ریڈیو پر اُردو کی براڈ کاسٹ بھی کرے۔ یعنی ایک ہی شخص میں یہ دونوں باتیں ہونی چاہئیں سو اس لحاظ سے میں ایک ہی تھا جو یہ دونوں کام کر چکا تھا۔ سو مجھے روم بھیج دیا گیا...... صبح یونیورسٹی شام ریڈیو۔ میرے لیے سن اکاون باون میں یہ ایک بڑا دلچسپ تجربہ تھا۔ ایک نوجوان آدمی بحیثیت پروفیسر وہاں کے بڑے بڑے لوگوں کو پڑھا رہا ہے، بڑے قابل لوگوں سے میل جول ہوا۔ کئی اٹالین جو پاکستان سے ٹریڈ کے لیے اردو پڑھ رہے تھے، کئی تھے جو فارن سروس میں آنا چاہ

رہے تھے۔ وہاں فارسی کے ایک پروفیسر ملے جو تھے تو اٹالین لیکن انہوں نے علامہ اقبال کی کتاب ''جاوید نامہ'' کا ترجمہ کیا تھا۔ عربی میں بھی وہ بڑے قابل تھے۔ قرآن شریف کا انہوں نے اٹالین میں ترجمہ کیا۔ میرا وہ تجربہ بڑے کمال کا تھا۔ چھٹیوں میں میں نے سیر کرتے ہوئے سوئٹزرلینڈ' فرانس اور زیادہ وقت انگلستان گزارا کیونکہ وہاں ہمارے دوست اعجاز بٹالوی بیرسٹری کر رہے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال بھی وہیں پر تھے۔

پھر تو آپ کی بڑی محفلیں جمتی ہوں گی؟

بڑی لمبی چوڑی محفلیں' دلچسپ باتیں ایک سکھ لڑکا کہنے لگا کہ یہ آپ کی اردو کیا چیز ہے' آپ لوگ لکھتے ''خواب'' ہیں پڑھتے ''خاب'' ہیں لکھتے ''خواہش'' ہیں پڑھتے ''خاہش'' ہیں یہ ''ہ'' کو کیا ہو جاتا ہے۔ اعجاز اسے سمجھا رہے تھے کہ ''و'' کہاں جا کر ساکن ہو جاتی ہے' کیسے آواز دیتی ہے۔ وہ لڑکا وہاں کئی سالوں سے بیرسٹری کر رہا تھا لیکن یہ بات نہیں سمجھ رہا تھا۔ اس پر ڈاکٹر جاوید اقبال نے بڑے دلچسپ انداز میں اسے کہا سنو یہ جو ''و'' ہے یہ کہتی ہے میں نے نہیں بولنا اس کا بولنے والا مزاج ہی نہیں ہے یہ ناراض ہو جاتی ہے۔ میں جاوید کا وہ انداز آج تک نہیں بھولا ہوں جب انہوں نے کہا کہ ''بھائی جب وہ نہیں بولتی ہے تو بس نہیں بولتی ہے تمہیں کیا۔''

جاوید صاحب کیا تب بھی ایسے ہی کھلے ڈھلے تھے؟

ہاں ہاں تب تو وہ اس سے بھی زیادہ کھلے ڈھلے تھے۔ بہت ینگ' میموں میں' صاحبوں میں' بڑے پالولر......

باپ کا ایڈوانٹیج کیا وہاں بھی انہیں تھا؟

بہت کم' کہیں کہیں' لیکن وہ اپنے بل بوتے پر ہی کافی تھے ان کا تھیس وہاں بڑا پاپولر ہوا تھا' مضامین بھی یہ لکھتے رہتے تھے۔

ان کا موضوع کیا تھا؟

ان کا موضوع تو فلاسفی تھا لیکن انہوں نے اسلام پر بھی وہاں ایک کتاب لکھی۔ اس طرح کی محفلیں ہوتی تھیں' بی بی سی کے علی نقی بڑے دلچسپ آدمی ہوتے تھے۔

نوعمری میں آپ کو اقبال سے لگاؤ رہا؟

ہاں ان کے فوت ہونے پر ہم نے سکھوں سے مل کر جلوس نکالا بہت لمبا چوڑا جلوس' بہت روتے ہوئے' تب میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا اگر میں لاہور یا اردگرد ہوتا تو شاید ملنے کا خواہش مند بھی ہوتا۔

کبھی جناح صاحب کو دیکھا؟

1942ء میں جب جناح صاحب جالندھر آئے تو مجھے بڑا شوق ہوا انہیں دیکھنے کا۔ میں فیروز پور میں ہوتا تھا سو ٹرین پر بیٹھ کر سخت سردی میں جالندھر گیا ' بڑا ہجوم تھا۔ وہاں ان کی آواز بڑی عجیب و غریب اور پروقار لگی۔ پھر جب پاکستان بنا تو ہمارا ایک قافلہ روتے پیٹتے لاہور پہنچا۔ جس میں میرے کنبے کے لوگ تھے ہم مزنگ روڈ پر ٹھہرے۔ میں نے بی اے کر رکھا تھا سو ایمپلائمنٹ کے آفس میں گیا انہوں نے تعلیم پوچھی تو کہنے لگے کہ اس معیار کی نوکری ہمارے پاس نہیں ہے پھر تیسرے دن گیا تو تعلیم میٹرک بتا دی۔ سو انہوں نے کہا بطور کلرک کہاں نوکری کرو گے۔ ریلوے میں' محکمہ فوڈ میں یا رفیوجی کیمپ میں؟ میں نے کہا رفیوجی کیمپ میں۔ سو انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ والٹن کے رفیوجی کیمپ میں گیا تو وہاں کیمپ انچارج تھے رانا صاحب انہوں نے کہا کہ بڑا سمارٹ سا لڑکا ہے۔ انہوں نے 65 روپے ماہوار پر مجھے وہاں رکھ لیا۔ کوئی پندرہ دن گزرے تو ہمارے سپرنٹنڈنٹ نے کہا کہ یہ تو کوئی افسر لگتا ہے باتیں بڑی اچھی کرتا ہے اسے اناؤنسمنٹ پر رکھ لیتے ہیں۔ جس میں لوگوں کا حوصلہ بڑھانے والی باتیں کرنے کی بھی تاکید تھی ۔ سو میں یہ کام کرنے لگا۔ پھر ایک اور صاحب بھی اس کام کے لیے لائے گئے ان کا نام تھا ممتاز مفتی' میں وہاں کلرک تھا۔ اس لیے جھجکوں لیکن چونکہ ان کا نام بطور رائٹر بھی جانتا تھا اور چاہتا تھا کہ میں انہیں بتاؤں کہ میں نے بھی کچھ افسانے لکھے ہیں پھر خواجہ نواب محمد شفیع دہلوی مقرر کر دیئے گئے یہ ان سے بھی بڑے افسانہ نگار تھے تب میں ڈرتے ہوئے ممتاز مفتی صاحب سے ملا تو وہ بڑی اپنائیت سے ملے۔ وہاں چونکہ مختلف ریجنل آفس بنے ہوئے تھے اس لیے ہم اپنے اپنے بوتھ پر کام کر رہے تھے۔ لیکن باہمی رابطہ سے ایک واسطہ بن گیا۔ اس کیمپ میں بو بہت تھی میں نے بو سے بچنے کے لیے اپنے کمرے کو کافی حد تک کاغذوں سے بند کر رکھا تھا۔ ایک دن لنگر سے میں روٹی لے کر مڑ ہی رہا تھا کہ سامنے میں نے جس لمبے قد کے آدمی کو دیکھا تو آپ یہ سمجھیں کہ روٹی میرے ہاتھوں سے گر گئی کیونکہ وہ قائداعظم تھے۔ بہت غمگین۔ پوچھنے لگے کہ یہاں روٹی کیسی ہوتی ہے۔ میں نے عرض کی کہ جی بہت اچھی ہے کہنے لگے کھا کر دکھاؤ پھر میں نے تھوڑی سی کھائی۔ میرا جی چاہا کہ ان سے عرض کروں ہمارے کمرے میں چلیں لیکن مجھے حوصلہ نہ پڑا۔ بس یہ ہے وہ ملاقات جس کا شرف مجھے رفیوجی کیمپ میں حاصل ہوا جب میں نے واپس آ کر نواب شفیع صاحب کو اس کا احوال سنایا تو وہ رونے لگے پھر وہ روٹی مفتی صاحب نے کھائی' نہ میں نے' نہ نواب صاحب نے۔

کسی جلسے میں مہاتما گاندھی کو دیکھا یا دیگر لیڈران کو؟

نہیں گاندھی جی کو تو نہیں دیکھا البتہ پنڈت نہرو کو دیکھا جب وہ موچی دروازے آئے تھے۔ علامہ مشرقی کی کتابوں سے بھرپور متاثر رہا' عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقاریر بھی بہت سنیں۔

آپ کا مذہبی بچ تو شروع ہی سے رہا ہے؟

یہ تمام شرفاء کے گھروں میں ہوتا ہی تھا۔ اب آپ خواہ میرے بچوں اور پوتوں کی طرح ہیں آپ لاکھ کہیں کہ میرا مذہبی بچ نہیں ہے۔ لیکن وہ تو بہرحال ہے۔ آپ کے محمود مرزا صاحب "پاکستان سب کا" کہیں" "اور مذہب اپنا اپنا" لکھیں لیکن مذہب کا رول تو رہے گا وہ تو وسعت نظر پیدا کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتے ہیں۔۔

کہتے ہیں جوڑیاں آسمانوں پر بنتی ہیں' باقیوں کا تو مجھے نہیں پتہ آپ دونوں کی جوڑی لگتا ہے واقعی آسمانوں پر بنی ہوگی؟

اس میں کوئی شک نہیں یہ اللہ ہی کی مہربانی ہے۔

آپا تو کہتی ہیں کہ اشفاق صاحب ہمیشہ میری حوصلہ افزائی کرتے رہے؟

ہاں یہ ٹھیک بات ہے جیسے وہ اردو میں کمزور تھی۔ میں نے محنت کروائی۔ وہ کام ایم اے پاس کرنے کے لیے کیا اور پھر اس نے میری حوصلہ افزائی پر باقاعدہ لکھنا بھی شروع کر دیا پھر ناول لکھا۔

"راجہ گدھ" تو ایک شاہکار بنا؟

کیا بات ہے جی' یہ سب اللہ کے کام ہیں۔

آپ کو یہ آئیڈیل جوڑی کیسی لگتی ہے جن کا ایک ہی رخ ہے ایک ہی روٹ ہے؟

- بالکل' کوئی جیلسی نہیں' آئیڈیل جوڑی ہے۔

اماں ابا سے آپ نے اس سلسلے میں اظہار کیسے کیا؟

میں اپنے ابا جی سے اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ انہیں FACE نہیں کر سکتا تھا اور ہمارے خاندان میں باہر شادیاں ہوتی بھی نہیں تھیں جبکہ ہم راجپوت تھے اور یہ جاٹ' بہرحال گھر میں دبا دبا ذکر ہوتا تھا۔ ایک دن ابا جی ان کے گھر کینال پارک میں گئے۔ بیٹھے تو دیکھا کہ وہ چارپائیاں اٹھا کر اندر رکھ رہی ہیں انہوں نے پوچھا کہ تم تو ایم اے پاس نہیں ہو؟ کہنے لگی ہاں

لیکن میں یہ کام کر لیتی ہوں اس پر وہ بڑے خوش ہوئے اور انہوں نے پاس کر دی لیکن ہماری اماں ذرا سخت تھیں وہ خاندان کی وجہ سے پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ ''چھٹہ'' نام ہی بڑا فضول ہے۔ اس طرح کے تاثرات ان کی فیملی میں بھی تھے لیکن بہرحال جو خدا کو منظور تھا ہو کر ہی رہا۔

خان صاحب آپ کے بچے کتنے ہیں؟

میرے تین بیٹے ہیں بیٹی کوئی نہیں۔

وہ کیا کرتے ہیں؟

میرا بڑا بیٹا پروفیسر ہے۔ وہ یہاں نہیں امریکہ کی یونیورسٹی میں ہوتا ہے۔ دوسرا فارما سوٹیکل کمپنی میں ملازم ہے تیسرا بنکر ہے۔

کیا وجہ ہے ادب کی طرف کوئی نہیں آیا؟

کوئی بھی نہیں آیا یہ ان کی مرضی ہے۔

''تلقین شاہ'' آپ کی ذات سے زیادہ قریب ہے یا ہدایت اللہ کے؟

میں سمجھتا ہوں کہ تلقین شاہ تو ایک مثالی شخص (Figure Examplary) ہے لیکن میرا مزاج جو ہے وہ ہدایت اللہ کا ہے یعنی کاش میں ایسا ہو سکوں۔ یہ نہیں کہ میں ہدایت اللہ ہوں بلکہ میرا رول ماڈل وہ ہے۔ اب لوگوں کا بھی رول ماڈل وہی ہے۔

ایک ''زاویہ'' پروگرام تھا؟

وہ تو ابھی بھی چل رہا ہے۔

ایک دفعہ بند ہوا تھا نا۔

ہاں' وہ بیچ میں بند ہو گیا تھا بلکہ میں آپ کو بتاؤں زاویہ کی ایک VIEWER ہیں مسز پرویز مشرف تو وہ مجھے کہنے لگیں کہ ''جی میں تو ایک ہی پروگرام دیکھتی تھی۔ آپ نے بند کیوں کر دیا۔ میں نے کہا' بی بی 12 اکتوبر کو فوجی آ گئے تھے تو ہم ان سے ڈر گئے۔ تو ان کا خاوند بھی سن رہا تھا۔ کہنے لگا''' سر! ہم نے آپ سے کیا کہا؟'' میں نے کہا ''دیکھئے آپ سے ہم نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن ہم T.V والے ہیں۔ ہمارا فرض ہے ڈر جانا کیونکہ ہم خوف زدہ لوگ ہیں ہم کہتے ہیں اللہ جانے پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ ہم پہلے ہی بوریا بستر سمیٹ کر گھر چلے جاتے ہیں

سوڈرنا ہمارا فرض ہے جیسے مارشل لاء لگانا آپ کا فرض۔" کہنے لگے "نہیں سر میں نے تو دیکھا ہی نہیں آپ اس کو چالو کریں۔"

آپ جمہوریت کے بڑے حامی ہیں لیکن جنرل مشرف اس کے باوجود آپ کی بڑی آؤ بھگت کرتے ہیں؟

ان کو ایسے ہی وہم سا ہوگیا ہے کہ میں کوئی بڑا اچھا لائق آدمی ہوں۔ نیک بھی ہوں حالانکہ ایسی بات نہیں ہے۔

انہوں نے آپ کو بلایا بھی تھا ایک مرتبہ؟ میں تو خوف زدہ ہوگیا بھلا میرا کیا کام۔

تو میں نے اپنی بیوی سے کہا۔ کہ مل ملا لو اب آخری وقت ہے۔

یہ بھی خوف زدہ ہوگئی۔ پھر میں نے کہا: "جی میرے پاس تو ٹکٹ نہیں ہے اس لیے میں کل انشاء اللہ....." انہوں نے کہا: "نہیں آپ کی ٹکٹ تو موجود ہے کور کمانڈر کے پاس بس آپ آجائیں، آدھا گھنٹہ میں۔"

میں پریشان تھا کہ پھر فون آگیا وہاں سے کہ "جی آپ نے اکیلے نہیں آنا" آپا کو بھی لے کر آنا ہے۔" آپا سے وہ بھی بڑے متاثر ہیں۔

میں نے کہا "جی انشاء اللہ۔"

تو پھر ہم ڈرتے ڈرتے روتے پیٹتے گئے شام کا وقت تھا آپ کی کوئی TRAINIY نہیں ایسے مواقع کی وہ کوئی سیاستدان نہیں، بیچاری اس نے کہا: "جی پرویز آپ نے تو بہت ڈالر اکٹھے کرنا شروع کیے ہیں وہ کریں گے پھر یہ کریں گے۔ مگر آپ ہمیں یہ بتائیں کہ WHAT ABOUT HUMAN BENEFIT کیونکہ اس کا تو کوئی پروگرام ہی نہیں۔ انہوں نے کہا کہ آپا یہ HUMAN BENEFITS کے لیے تو کر رہے ہیں۔ ملکی حالات بہت خراب ہیں، اقتصادی صورت حال بہت بری ہے وغیرہ وغیرہ۔

تو اس نے کہا نہیں جی میں یہ سمجھتی ہوں کہ میرے ملک کے جو چودہ کروڑ بندے ہیں وہ روٹی کپڑا اور مکان نہیں مانگتے۔ وہ تو ایسے کندھے کی تلاش میں ہیں جس پر سر رکھ کر وہ رہ سکیں۔ اور میرے ملک میں وہ کندھا نہیں ہے۔ وہ کیسے PROVIDE کریں گے آپ، پھر وہ چونکے۔

وہاں ایک اور بھی جرنیل تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپا آپ نے سنا ہے پنجابی کا محاورہ کہ

جدھی کوٹھی وچ دانے
اوہدے کملے وی سیانے

تھے لیکن ان کی سوچ SYSTEM کے اندر چلتی ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جو SYSTEMS ہیں وہ ماتحت ہوتے ہیں' نوع انسانی کے۔ جو شخص نوع انسانی کی بہتری کا سوچنے لگے پھر وہ اس طرف آئے تو بہتر ہوگا لیکن جو شروع یہاں سے کرتا ہے مثلاً چند روز قبل PRESIDENT جب گورنر ہاؤس آئے ہوئے تھے تو وہ چار باتیں بتا رہے تھے کہ ہم TRANSPARENCY کریں گے۔

دوسرے یہ کہ ڈالر آ جائے گا۔ پیسے آ جائیں گے تو ہم یہ کام کریں گے۔

لیل ونہار اور ریڈیو سے آپ اُردو سائنس بورڈ میں کیسے پہنچ گئے؟

مجھے سائنس بورڈ میں بلا لیا گیا کہ آپ یہ کام تو کر دیں چونکہ اس میں تو کوئی EDITORIAL نہیں ہوتا تھا اس لیے وہاں چلا گیا۔ الحمد للہ وہاں پر تیئیس برس گزارے یعنی ساری عمر کٹ گئی۔

یہ طویل تجربہ کیسا تھا؟

بہت اچھا! یہ تو ایک لمبی کہانی ہے الگ سے ہی ایک مضمون ہوسکتا ہے۔ لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ ایک تو میرے ذہن میں اٹلی رہنے کی وجہ سے جیسے کہ میں کہتا ہوں کہ مجھے Experience ہوا میں تصویریں دکھا رہا تھا اپنی بیوی کو اٹلی کے زمانے کی اس میں ایک چھوٹی سی کار تھی جسے کہتے ہیں چو بیاد Feat car تھی کہنے لگی یہ کار اتنی چھوٹی؟

میں نے کہا ایسی ہی ہوتی تھی لیکن اس میں چار بندے بیٹھ جاتے تھے آسانی سے' میں اس پر دفتر آتا جاتا تھا یہ بہت POPULAR تھی' کہنے لگی کمال کی ہے یہ کہاں کی ہے میں نے کہا اٹلی کی۔

اس نے کہا: ''کیا اٹلی کار بھی بنا لیتا ہے۔'' مزید کہنے لگی کہ: ''وہاں تو کوئی انگریزی بھی نہیں جانتا تو جس ملک میں انگریزی ہی نہ پڑھائی جاتی ہو تو کیسے ترقی کرسکتا ہے۔'' یہ اس کا خیال تھا اور ہم سب کا یہی خیال ہے۔

تو میں نے کہا کہ یہ ساری کی ساری ITALIAN کی بنائی ہوئی کار ہے اور کوئی بھی

انگریزی نہیں جانتا وہاں پر۔ اس پر کہنے لگی جبھی اتنی چھوٹی ہے۔
یہاں بات ہنسی پر ختم ہوگئی۔
لیکن جب میں سائنس بورڈ میں آیا تو میرا یہ یقین پختہ ہوگیا کہ اور مضامین تو چاہے اپنی زبان میں پڑھائے جائیں یا نہ پڑھائے جائیں' سائنس کے مضامین جب تک اردو میں نہیں ہوں گے یا اپنی زبان میں نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک کوئی اختراع کوئی ایجاد ہو ہی نہیں سکتی۔ اپنی اس ذمہ داری کے دوران ایک دفعہ ایک میڈیکل کالج میں گیا اور وہاں کے پرنسپل سے ملا' ان سے کہا کہ جناب آپ جو پڑھاتے ہیں اس کورس کو اردو میں تبدیل کروائیں۔
کہنے لگے نہیں نہیں اردو میں نہیں کرنا' اردو میں بندہ مرجاتا ہے۔ انگریزی میں ٹھیک رہتا ہے' بندہ نہیں مارنا چاہیے۔ میں نے کہا آپ کیا پڑھاتے ہیں؟ انہوں نے مجھے اپنا کورس دکھایا' اس میں 100 نمبر کا ایک پرچہ تھا جنسی امراض کے اوپر۔ میں نے کہا آپ یہ کیوں پڑھاتے ہیں؟ ہمارے ملک میں تو ہے ہی نہیں یہ مرض اللہ کے فضل سے مہربانی ہے' سوزاک آتشک وغیرہ نہیں ہے' اس میں ہماری کوئی خوبی نہیں لیکن یہاں یہ ہے ہی نہیں کہنے لگے بس جی یہ شروع سے کورس میں چلا آرہا ہے اور انگریزوں نے بنایا ہے یہ کورس۔ ولایت میں کیونکہ یہ مرض بہت عام ہے اس لیے وہاں یہ ہے پھر میں نے ان سے کہا مجھے ذرا وہ پیپر دکھائیں جن میں لاکڑہ کاکڑہ یعنی جو بچوں کو خسرہ ہوجاتا ہے' اس کے متعلق بتائیں۔
کہنے لگے چونکہ خسرہ کے اوپر کوئی کتاب انگریزی میں نہیں ہے اس لیے ہم یہ کم ہی پڑھاتے ہیں۔ میں نے کہا جناب کوئی بچہ حرامی ہوگا جس کو خسرہ نہ ہو یہ تو سب کو ہی ہوتا ہے۔ خسرہ کے متعلق جو کتاب اُردو میں لکھی جائے گی ظاہر ہے وہ زیادہ پڑھی جائے گی مگر وہ تو موجود ہی نہیں ہے۔
ہماری ساری زندگی چونکہ مرہون منت ہے انگریز حکمران کی اس لیے اُردو میں کچھ تو کتابیں لکھی نہیں جاسکیں' لیکن کوئی بھی کتاب جسے آپ کہہ سکیں کہ وہ مخترع ہے یعنی اس نے کوئی اختراعات کی ہو وہ اُردو میں نہیں آسکی' ماسوائے میری ایک کتاب کے ''ریگستانی ٹڈی کا ہضمی نظام۔''
تو یہ کتاب جب ہم نے چھاپی اور اعلان کیا کہ چھاپ رہے ہیں تو ہمیں چیکوسلواکیہ سے ایک خط آیا کہ اس کی 100 کاپیاں ہمیں بھیج دیں۔
میں نے کہا کہ ابھی یہ اردو میں ہے۔ انہوں نے کہا' کچھ بھی ہو ہم ترجمہ کرالیں گے

لیکن ہم اس کے ہضمی نظام کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔
آپ نے بیوروکریسی کے متعلق کچھ نہیں بتایا؟
بچے! بیوروکریسی بیچاری تو کچھ نہیں کرتی بس ایک نوجوان کو جو ماشاء اللہ گریجوایٹ بھی ہے اور شریف گھرانے کی وجہ سے کچھ اخلاقی ویلیوز بھی رکھتا ہے' اسے محض جھوٹ کی عادت ڈال دیتی ہے یا تھوڑی بہت ہیرا پھیری کے گر سکھا دیتی ہے۔ بیوروکریٹ ان کے سابقہ کریکٹر کو بس زائل کرتا ہے کیونکہ وہ اسے جب تک Emotional نہیں کرے گا اس کی گرفت کمزور رہے گی عطاء الرحمٰن نے مجھے کہا کہ میں آپ سے بڑی محبت کرتا ہوں مجھے بتاؤ کمپیوٹر اور آئی ٹی وغیرہ کے ذریعے نوجوانوں کو کیسے تگڑا کیا جائے۔ میں نے کہا کہ محض ہزار ڈالر کمانے سے تو وہ تگڑا نہیں ہوگا شاید اس سے الٹا کمزور ہوجائے ہماری کچھ اخلاقی قدریں بھی ہیں' کچھ ادھر بھی توجہ دو۔
میں نے بیوروکریسی کی اخیر یہ دیکھی ہے کہ چند سہولتیں' چند مفادات کے وہ بھوکے ہوتے ہیں اس سے آگے کا وہ سوچ ہی نہیں سکتے؟
اور مفادات بھی گندے' کار' ڈرائیور' چپڑاسی بچوں کو سکول لانے لے جانے والا۔
بیوروکریسی کا پہلا تحفہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہونے کا بندے میں جو ڈنک ہوتا ہے وہی نکال دیتے ہیں۔ اصل نکال دیا اور پتہ بھی نہیں چلا' چھتر کھائیں گے تو گھر آجائیں گے۔
آمریت کے مقابلے میں آپ جمہوریت کو بہتر قرار دیتے ہیں لیکن ہمارے ہاں اگر آپ تجزیہ کریں تو قریباً دس فی صد لوگ ہوتے ہیں جن کا یہ سارا مخمصہ ہوتا ہے نوے فی صد تو اس سے بے خبر ہوتے ہیں؟
بالکل' کبھی کسی نے اس بات پر غور ہی نہیں کیا کہ کبھی ہماری جمہوریت کا بھی جائزہ لے کر دیکھ لیا جائے۔ یہ نیچے عام لوگوں تک تو جا ہی نہیں پاتی اوپر ہی اوپر ایم این ایز اور ایم پی ایز کے چمچوں کی چم چم ہوتی ہے۔ مختلف حربوں سے جو جیتتے ہیں وہ پہلے تو اسمبلی میں گروپوں کی صورت اختیار کرتے ہیں' پھر ان میں کچھ اجلاس میں سونے والے ہوتے ہیں اور کچھ پارٹی کے لیڈر انگوٹھا چھاپ ہوتے ہیں جو اسمبلی میں ٹکا ٹک کرتے ہیں جو منسٹر بن جاتے ہیں وہ ذاتی کمائی میں لگ جاتے ہیں۔ جو بول رہے ہوتے ہیں ان کی نظر آئندہ کی وزارت پر ہوتی ہے۔
سر! ذرا سیکولرزم کا بھی پوسٹ مارٹم کریں؟

سیکولرزم سے عام ذہنوں میں جو کچھ آتا ہے وہ ہے Nonrligious یعنی Religion سے اس کا کوئی تعلق نہیں' مجیب کو فکر لگی ہوئی ہے کہ اشفاق صاحب یہ کیا ہو رہا ہے۔ ملک سب کا' مذہب اپنا اپنا' یہ NGO یہ سیمینار' یہ انٹرنیشنل فورم وغیرہ کیا کر رہے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں ہمارا مذہب اس نظریے کو قبول نہیں کر سکتا اس کی وجہ ایک تو ہماری عائلی زندگی ہے' مرد عورت کے تعلقات ہیں دوسری ہماری اجتماعی زندگی ہے جو مذہب سے عبارت ہے۔

ہماری گھریلو زندگی میں ماں کا مرتبہ باپ سے زیادہ ہے؟

نہیں اس میں نہ ماں کا رتبہ زیادہ ہے نہ باپ کا دونوں کو اسلام ادب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسلام تو اس کو نہیں مانتا کہ عورت کا درجہ مرد سے زیادہ ہو۔

جو تکلیف ماں سہتی ہے اس کا کوئی مقابلہ نہیں ہے؟

یہ جو باہر کھڑا دھوپ میں سنگھاڑے بیچ رہا ہے' جس نے ریوڑیوں کا چھابہ لگایا ہوا ہے اور سات سالوں سے یہ تکلیف سہہ رہا ہے۔ 9 مہینے کی تکلیف اس سے کیسے بڑھ گئی۔ اس حرام زادے کا تو ستیاناس ہو گیا۔

آپ کی نظر میں پاکستان کی پرابلم نمبر 1 کیا ہے؟

ہماری پرابلم نمبر 1 یہ ہے کہ یہ جو ہمارا حکمران طبقہ ہے ان کا پاکستان کے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے' پاکستان کی ذات سے' پاکستان کے کلچر سے' پاکستان کی دھرتی سے' ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہاں پیدا ہونے والی خوراک سے' یہاں کی گیس اور پٹرول سے تو ان کا گہرا تعلق ہے بس سے وہ فائدے بھی اٹھاتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں کے لوگوں کو برا بھی کہتے ہیں اس کے بندوں کو نہیں مانتے لیکن اس ملک کی جان بھی نہیں چھوڑتے۔ کاش کوئی ایسا طریقہ ہو میں اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان خواص کو انہی بیچارے عوام میں شامل کر دے۔

آپا صغراں جو تندور میں روٹیاں لگاتی ہے' یہ لوگ اس کو بھی پورا پاکستانی مان لیں' اس بیچاری نے تو کوئی کالم نہیں لکھنا' اس نے تو روٹیاں ہی لگانی ہیں نا لیکن اسے عزت تو دے دو' یہ تو اس کا حق ہے نا...... لہٰذا ہمارا مسئلہ نمبر 1 یہی ہے کہ ہمارے پڑھے لکھے سیانے طبقے نے ہمارے اوپر ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرز پر حکومت شروع کر دی ہے' ایسٹ انڈیا کمپنی میں تو پھر بھی کچھ خوبیاں تھیں جبکہ ہمارے موجودہ حکمران طبقے میں وہ بھی نہیں ہیں جب انگریز حکمران تھا اور میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتا تھا تو میں اس کو ڈرا دیتا تھا کہ کل میری گیارہویں شریف کا ختم ہے اس لیے میں چھٹی کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن یہ جو بدمعاش ہیں یہ کہتے ہیں کون سی گیارہویں شریف' ہمیں نہیں پتہ' جا بیٹھ جا کے۔

آپ پاک بھارت تعلقات کو کیسے دیکھنا چاہتے ہیں؟

میں پاک بھارت تعلقات کو اس طرح دیکھنا چاہتا ہوں کہ بھارت جو ایک بڑی تہذیب ہے وہ لوٹ کر اپنی بڑائی کی طرف آ جائے اور یہ سوچے کہ میں نے کتنا چھوٹا رول ادا کیا ہے۔ اتنا بڑا ہونے کے باوجود آخر چھوٹا پن کیوں ہے؟

عالم اسلام میں جمہوریت نہ ہونے کی وجوہ آپ کی نظر میں کیا ہیں؟

عالم اسلام شائد جمہوریت کا زیادہ قائل ہی نہیں ہے۔ معلوم نہیں اگر ادھر جمہوریت قائم ہو بھی جائے تو کیا حال ہو جائے۔ میں جموریت کے بڑا حق میں ہوں مگر اسی جمہوریت نے فاشزم کو بھی جنم دیا ہے۔ بھٹو کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ہمارے ملک میں بھی جمہوریت کے نام پر ایسے لوگ آتے رہے ہیں جن کو آپ انسان بھی کم ہی کہیں گے۔ شائد عالم اسلام کو جمہوریت کی ضرورت نہیں ہے ان کی فرصت اپنے خدا کو خوش کرنے کی ہے آپ اس کے طریقے ڈھونڈیں۔

ایک ملاقات جو آپ کبھی نہیں بھلا سکتے؟

1966ء میں ایک ملاقات چیئرمین ماؤ سے ہوئی تھی جو بڑی ہی یادگار تھی اس کے بارے میں میں رپورتاژ لکھ بھی چکا ہوں۔ ایک ملاقات میں نے اپنے بابا حضرت سائیں فضل شاہ صاحب نور والے سے کی جو پھیلتے پھیلتے میری ساری زندگی پر حاوی ہو گئی اس کی تبلیغ میں ابھی تک کیے چلا جا رہا ہوں۔

آپ دیہی اور شہری زندگی کا فرق کس طرح دیکھتے ہیں؟

بنیادی بات یہ ہے کہ شہری بندہ اپنے آپ کو انسان سمجھتا ہے جبکہ دیہی بندہ باوجود اس کے کہ وہ بھی انسان ہی ہوتا ہے مگر شہر کا بندہ اس کو بندہ تسلیم ہی نہیں کرتا۔ آپ اس کو ان پڑھ کہہ کر دھتکار دیتے ہیں۔

دنیا میں سب سے خوبصورت خطہ کون سا لگا؟

اٹلی مجھے بہت پسند آیا تھا۔ تاریخی اعتبار سے بھی اور حسن کے اعتبار سے بھی۔

عزت نفس کی بحالی کا شدید احساس کیسے جاگزیں ہوا؟

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا چونکہ میں فکشن رائٹر ہوں اس لیے جب میں اپنے گرد و نواح میں کسی کو ذلیل ہوتے دیکھتا ہوں تو مجھے بہت محسوس ہوتا ہے۔ مثلاً ایک آدمی بھوکا ہو تو مجھے اس سے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنی کسی کو ذلیل ہوتے دیکھ کر ہوتی ہے۔

جب کوئی کسی کو اس کی محنت کا معاوضہ نہ دے تو......؟

بہت بُری بات ہے۔

کیا غربت سے بڑی بھی دنیا میں کوئی تکلیف ہے؟

غربت سے بڑی تکلیف شائد کوئی نہ ہو لیکن عزت نفس خراب ہونے کی تکلیف بہت زیادہ ہوتی ہے میں نے ولایت میں بھی غربت کو دیکھا ہے لیکن بحثیت شہری ان کے حقوق پامال نہیں ہوتے کوئی یہ نہیں کہتا کہ پیچھے ہو کر کھڑا ہو۔ عزت نفس کے لٹنے سے ہی غربت کا تصور بدنما بنتا ہے۔

جنت میں 70 حوروں کے ساتھ رہنا پسند کریں گے یا آپا جی کے ساتھ؟

میں یقیناً ستر حوروں کے ساتھ رہنا ضرور پسند کروں گا کیونکہ وہ بھی آپا جی کی سہیلیاں ہی ہوں گی اور ان کے جیسی ہی ہوں گی۔

زندگی کا خوشگوار ترین اور ناگوار ترین دن؟

ناگوار ترین تو شاید اللہ کے فضل سے کبھی آیا ہی نہیں ہے۔ اچھے بندے ملتے رہے ہیں اور زمانہ بھی میرے ساتھ اچھا رہا ہے۔

پسندیدہ حکمران؟

پاکستان میں میرا پسندیدہ حکمران چودھری محمد علی تھا۔

پسندیدہ شاعر؟

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے نقشِ امکاں کو ایک نقشِ پا پایا

پسندیدہ شام؟

بہت شامیں آئیں۔ 64ء میں ٹی وی کے نیا آنے سے جو شامیں جمتی تھیں وہ ساری پسندیدہ تھیں۔

پسندیدہ شہر؟

روم میرا پسندیدہ شہر ہے۔

پسندیدہ مشروب اور ڈش؟

سردائی میرا پسندیدہ مشروب ہے، میٹھی ڈشیں پسند ہیں۔

کیا آپ ڈاکٹر جاوید اقبال کی کتاب ''اپنا گریباں چاک'' پر کوئی کمنٹس دینا چاہیں گے؟

میں نے وہ کتاب پوری پڑھی ہے اور مجھے بڑی پسند آئی ہے۔ بالخصوص ان کی خود کلامی والا حصہ تو مجھے بہت ہی اچھا لگا ہے اور شائد اس پر بہت کم لوگ توجہ دیں گے لیکن اصل چیز یہی

ہے۔ میرے خیال میں شائد یہ سوانحی لحاظ سے اردو میں پہلی کتاب ہے جس میں اس اسلوب کو اپنایا گیا ہے اس سے صاحب کتاب گریٹ رائٹر اور گریٹ تھنکر نظر آتا ہے جاوید بڑا لبرل آدمی ہے۔ اچھے اخلاق کا مالک ہے جو ویسٹ کا خاصہ ہے میرے خیال میں جاوید پر آئی ڈورَ ٹرَ کی پرورش اور تربیت کے بھی بڑے مثبت اثرات ہیں اور پھر وہ ولایت بھی گئے اور وہاں کی تہذیب کے لبرل اثرات بھی ہوئے جس طرح ڈاکٹر جاوید ہیں یا جس طرح آپ لبرل ہیں میں اس کی قدر ضرور کرتا ہوں لیکن میں تو لبرل نہیں ہوں کوئی بھی پکا مسلمان لبرل نہیں ہوتا۔

آپ کی نظر میں عشق محبت؟

یہ ایک نارمل زندگی کا بہت اہم حصہ ہے۔ ہر انسان اس میں سے گزرتا ہے نہ گزرے تو مکمل نہیں ہوتا۔

نفرت وحقارت؟

ایسا فعل ہے جو آدمی نے سیکھا ہے جبلی چیز نہیں ہے اسے آسانی سے چھوڑا جاسکتا ہے۔

لالچ اور حسد؟

یہ بڑی جبلی چیزیں ہیں مثلاً ہم پیشہ ور لوگ ہیں تو حسد تو ہمارے اندر آئے گا۔ چاہے آپ اس کا اظہار نہ کریں لیکن من میں آئے گا۔

کیا آپ کو غصہ آتا ہے؟

بہت زیادہ مگر اب ہی آنے لگا ہے نوجوانی میں بالکل نہیں آتا تھا۔ میں ایک اچھا خوشگوار سا بوڑھا رہنا چاہتا ہوں مگر ایسے رہا نہیں جاتا۔

تصنع اور ریاکاری؟

یہ لوگوں میں بہت ہوتی ہے مگر اس کے ساتھ کوئی مجھے زیادہ برا نہیں لگتا۔

غصے کا اظہار کیسے کرتے ہیں؟

اونچی بول کر اور طنزیہ جملے کہہ کر۔

زندگی میں کب پھوٹ پھوٹ کر روئے ہیں؟

جی ہاں بہت زیادہ' بابوں کے ساتھ ڈیروں پر ملاقاتوں میں بے وجہ بھی کئی دفعہ گریہ طاری ہوگیا یا کسی بابے یا صاحب حال نے کوئی ایسی بات دانش و معرفت کی کہہ دی یا کئی قوالیاں سن کر رونا آجاتا ہے۔

جب بہت فرسٹریشن محسوس کی؟

کئی ایسے مواقع آئے ہیں، ایسی صورت میں ایک لالچی بچے کی طرح خدا کی طرف بھاگتا ہوں۔

جب بے بسی محسوس کی؟

میں تقریباً ہر جھوٹے آدمی کے سامنے بے بس ہو جاتا ہوں۔ اس کا شافی جواب نہیں دے سکتا جھوٹ کے سامنے بے بس ہوں۔

زندگی اور موت؟

زندگی سے پیار ہے اور موت کی حقیقت تسلیم کرنے کے باوجود اس سے خوف اور گھبراہٹ ہے اسے دور دھکیلنے کو جی چاہتا ہے۔

آپ نے اپنے کام کے حوالے سے ایک بھرپور اور کامیاب زندگی گزاری ہے۔ اگر میں آپ سے یہ پوچھوں کہ آپ نے زندگی سے کیا سبق سیکھا ہے؟

میں نے زندگی سے یہ بنا بنایا سبق سیکھا ہے کہ انسان کو ہر حال میں محنت اور بے حساب محنت کرتے رہنا چاہیے، مسلسل کے ساتھ، لیکن اس محنت کا تعلق کامیابی کے ساتھ نہیں ہے وہ تو خدا نے دینی ہے لیکن بشریت کی شان یہ ہے کہ وہ محنت سے جی نہ چرائے۔

کوئی خواہش جو ہنوز تشنہ کام ہے؟

کوئی نہیں، میری کوئی خواہش پیدا بعد میں ہوتی ہے مکمل پہلے ہی ہو چکی ہوتی ہے۔ زیادہ تمنائیں پیدا نہیں ہوتیں، بہت اچھا وقت گزرا، ٹھنڈا گرم سب ملتا رہا۔ میں ان ایک لاکھ لوگوں میں سے ہوں جو پاکستان کے حکمران ہیں ان میں تمام شعبہ جات کے لوگ ہیں، اصل مسئلہ تو دوسرے طبقے کا ہے۔

یہ تو بڑی تلخ حقیقت ہے؟

بہت تلخ چودہ کروڑ ان ایک لاکھ کے غلام بنے ہوئے ہیں۔

خداوند آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے لیکن اپنے بعد کس طرح یاد رکھے جانا پسند کریں گے؟

میری آرزو ہے کہ میری قبر اچھی سی پکی سی ہو، جس پر ایک ہینڈ پمپ ضرور ہو، تاکہ مسافر وہاں پانی پی لیا کریں۔ ایک ڈھولکی والا ہو، جو قوالی کے انداز میں کچھ پڑھ رہا ہو، شعر چاہے غلط ہی پڑھے کیونکہ پڑھے لکھوں کے پاس تو وقت ہوتا نہیں ہے، وہ تو کوئی ان پڑھ آدمی ہی ہو سکتا ہے۔

(ماہنامہ ''قومی ڈائجسٹ'' لاہور)

گلزار جاوید

اشفاق احمد سے ایک انٹرویو

☆ بیشتر انٹرویوز میں آپ اپنے ادبی کیریئر کی ابتداء رسالہ ''علم الوقیع'' کو بتاتے ہیں یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ایک نوعمر بچہ بلا کسی شوق و تجربہ کے ادبی رسالہ نکال بیٹھے جبکہ گھریلو ماحول بھی ادبی نہ ہو ہمارے خیال میں یہ شوق کی انتہا تھی ہم ابتداء کے بارے میں جاننا چاہیں گے؟

☆☆ ......رسالہ ''علم الوقیع'' میں نے ساتویں جماعت میں نکالا تھا۔اس لفظ کے معنی نہ مجھے جب معلوم تھے نہ اب معلوم ہیں۔میرے ایک بزرگ یہ ترکیب (علم الوقیع) اپنی گفتگو میں استعمال کرتے تھے۔مجھے اچھی لگی میں نے اپنے رسالے کا نام رکھ دیا۔میرے رسالہ علم الوقیع کا صرف ایک ہی شمارہ ''شائع'' ہوسکا کیونکہ میں ہی اس کا کاتب میں ہی مضمون نگار میں ہی مصور اور میں ہی اس کا دفتری تھا۔اس میں بیشتر ''مضمون'' میرے تھے۔نظمیں غزلیں قینچی سے کاٹ کر چپکائی گئی تھیں۔تصاویر زیادہ تر رسالہ عصمت' تہذیب نسواں اور خاتون بمبئی سے لی گئی تھیں۔پرنٹ لائن یہ تھی: بہ اہتمام لالہ موتی رام کے امرت الیکٹرک پریس میں چھپا اور اشفاق احمد نے موضع مکتسر سے شائع کیا۔

☆ ابتدا میں آپ شاعری کی طرف مائل رہے بعد میں افسانے اور ڈرامے کی طرف متوجہ ہو گئے سفرنامہ میں بھی انفرادیت کو نمایاں رکھا یہ سب کچھ ارادی تھا یا حالات کے تحت ایسا ہوا؟

☆☆ دونوں ہی چیزیں تھیں۔ارادتاً بھی ادیب بننا چاہتا تھا اور حالات بھی مجبور کر رہے تھے۔میری بڑی آپا اور بڑے بھائی پڑھنے لکھنے سے گہرا شغف رکھتے تھے ان کے پاس بہت سے رسالے اور اخبار آتے تھے جن میں مشاہیر کی تحریریں ہوتی تھیں۔میں ان کی گھن گرج سے بہت متاثر ہوتا۔خاص طور پر جب میری آپا بھائی جان کو اور بھائی جان آپا کو مولانا ظفر

علی خان کی نظمیں اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نثر پڑھ کر سناتے ۔ میرے اندر ذاتی تخلیقی صلاحیت کوئی خاص نہیں اس لئے میں نے ہر صنف کی طرف منہ مارا اور ہر جگہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا ۔ وہ بات جو عظیم رائٹرز کا طرہ امتیاز ہے وہ میری گرفت میں نہ آ سکی ۔ ابتدا میں میرا ایک افسانہ مشہور ہو گیا اور اسی کے زور پر یار لوگ مجھے کھینچ کر یہاں لے آئے کہ اب میرا گوشہ شائع کیا جا رہا ہے ۔ اس سے زیادہ پرسکون، خوش گوار اور Rewarding بات اور کیا ہوتی کہ میں پورا ادیب نہیں اور مجھے اتنا بڑا اعزاز عطا کیا جا رہا ہے ۔

☆ آپ کا ادبی سفر کم و بیش پانچ دہائیوں پر مشتمل ہے کیا آپ کسی ایک دہائی کا تعین کر سکتے ہیں جس میں بھرپور اور مثبت ادب تخلیق کیا ہو؟

☆☆ اس بات کا جواب تو کوئی نقاد ہی دے سکتا ہے البتہ اتنی بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ شروع شروع میں میں نے ادب تخلیق کرنے کی کوشش کی ۔ اس کے بعد ادب اور تخلیق دونوں کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا ۔ درمیان میں میں نے اکی دکی اور ٹوٹی ٹوٹی کوششیں کیں لیکن گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا ۔

☆ آپ نے کم و بیش بیس برس میڈیا کی نظر کئے اس دوران ادب کی طرف آپ کی توجہ کم کم رہی کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے اردو ادب کی اس حق تلفی کا ازالہ کر دیا؟

☆☆ میڈیا کی طرف میرا دھیان گھر گھرہستی کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے کارن ہوا لیکن وہاں بھی مجھے وہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی جس کا تصور باندھ کر میں وہاں گیا تھا ۔ میرے ڈرامے ہر شخص کے سر پر سے گزر گئے ۔ موضوعات کو اجنبی اور انداز کو تھکا دینے والا قرار دے کر انہیں ناپسندیدگی کے کھڑے میں ڈال دیا گیا ۔ مکالموں کی طوالت اور " فلسفے کی بھرمار سے ناظرین / سامعین تنگ آ گئے اور بالآخر مجھے اس صنف سے بھی جزوی طور پر الگ ہونا پڑا ۔ میں پی ٹی وی کا وہ واحد مصنف ہوں جس کے کسی سیریل یا سیریز کا کوئی ویڈیو تیار نہیں ہوا (اس لئے کہ مانگ نہیں) میرے ڈراموں کی چونکہ Viewing بہت محدود ہے اس لئے سپانسر انہیں اپنے اشتہاروں سے بھی نہیں نوازتا ۔

اب میں عمر کے اس حصے میں ہوں کہ اپنے لئے کوئی تیسری راہ تلاش نہیں کر سکتا ۔ چونکہ لکھنے لکھانے کا ایک نامی چور ہوں اس لئے تحریر کی ہیرا پھیری سے بھی نہیں نکل سکتا ۔ اب یہ آخری وقت ہیرا پھیری میں گزر رہا ہے ۔

☆ آپ کی اپنے بارے میں یہ رائے کہ دوسروں کے مقابلے میں آپ کا ڈویلپمنٹ پراسس تیزی اور شدت سے ہوا............اس کے اسباب کیا تھے؟

☆☆ اصل میں خوش قسمت تھا۔ نوکریاں بدلیں۔ سفر کئے۔ نئے نئے کلچر اور مختلف کراس سیکشن آف سوسائٹی میں دور دور تک گھوما پھر حضرت سائیں صاحب نور والے کے ڈیرے پر تقریباً گیارہ برس گزارے۔ تجسس، تشکیک، طرب، تحیر، مایوسی ہر طرح کے موسموں سے لطف اٹھایا۔ ملاّ بن کر وقت نہیں گزار سکا۔ نہ دینی ملاّ نہ سائنسی ملاّ نہ سیاسی ملاّ۔ اس لئے تیزی کے ساتھ تبدیلیوں سے گزرا۔ اس وقت حضرت علامہ کی ایک چیز یاد آ گئی کہ۔

چہ کنم کہ فطرت من بہ مقام در نہ سازد

دل نا صبور دارم چو صبا بہ لالہ زارے

چو نظر قرار گیرد بہ نگار خوب روئے

تپسد آں زماں دل من پئے خوب تر نگارے

☆ ایک وقت تھا کہ آپ بانو قدسیہ کے متعلق ازراہِ مذاق کہا کرتے تھے کہ وہ میرے جملے چرا کر اپنی تحریروں میں شامل کرتی ہیں آج کل آپ کہتے ہیں کہ لوگوں کا خیال ہے کہ بانو قدسیہ مجھے مضامین لکھ کر دیتی ہیں اس تضاد سے آپ کا قاری کنفیوژن کا شکار ہے؟

☆☆ ایسے سوال عام طور پر تفننِ طبع کے طور پر کئے جاتے ہیں اور ان کا لیول خواتین پرچوں کے کالم ''ہماری ڈاک'' کا سا ہوتا ہے۔ کچھ لوگ ہنس لیتے ہیں کچھ خوش ہو جاتے ہیں کچھ سادہ لوح ایسی باتوں کو سچ مان لیتے ہیں۔ ایک سنجیدہ قاری کو اچھی طرح سے علم ہوتا ہے کہ یہ کس کی تحریر ہے اور اس کے اندر کس کا مزاج چھلک رہا ہے۔ ادب کا قاری کبھی کنفیوژن کا شکار نہیں ہوتا تماش بین البتہ لطف اندوزی کے ساتھ ساتھ شپٹایا سا بھی رہتا ہے۔ اس کو کنفیوژ ہی رہنا چاہئے کیونکہ یہ اس کا حق ہے۔

☆ آپ کے خیال میں اردو ادب نے اب تک کتنے عالمی پائے کے ادیب پیدا کئے ہیں؟

☆☆ اردو ادب نے اپنی مختصر سی عمر میں بہت سے اعلیٰ پائے کے ادیب پیدا کئے ہیں جن میں افسانہ نگاروں کا رتبہ بہت ہی بلند ہے۔ میرے خیال میں اردو افسانہ دنیا کے دوسرے ''دھتر خان ادب'' سے اگر سربلند نہیں تو اس کے برابر کا ضرور ہے۔ پرانے افسانہ نگاروں کے ساتھ ساتھ بعد کے آنے والے افسانہ نویسوں نے بھی ایسی غضب کی کہانیاں لکھی ہیں اور لکھ رہے ہیں کہ عقل دنگ ہوتی ہے۔ نئے افسانہ نگاروں میں میرے ذاتی اندازے کے مطابق، خواتین افسانہ نگار بہت آگے ہیں اور انہوں نے بہت ہی خیال انگیز کہانیاں لکھی ہیں۔

ہمارے یہاں اگر کوئی کمی ہے تو Essay کی ہے۔ ابتدا میں سرسید اور ان کے ساتھیوں نے اس کی طرف بطور خاص توجہ دی تھی لیکن ان کے بعد کے ادیب اس بوجھ کو اٹھا نہیں سکے۔ مضامین نہ کی کمیابی سے اردو ادب کا دامن ابھی تک خالی ہی ہے۔ پورے طور سے خالی نہیں تو ہولا ضرور ہے۔

☆ آپ کے بارے میں ایک رائے یہ پائی جاتی ہے کہ آپ گاڑی کا پہیہ آگے کے بجائے پیچھے کی طرف گھمانے کی کوشش میں مصروف ہیں یعنی سائنسی ترقی کے جدید ترین اور تیز ترین دور میں پیروں فقیروں اور ملّا ازم کا پرچار کر رہے ہیں مثال کے طور پر آپ کے ٹی وی پلے سائیں اور سائیکٹر یسٹ کا نام لیا جا سکتا ہے؟

☆☆ میں روایتی کہانیوں کا وہ ذمہ دار لڑکا ہوں جسے معلوم ہے کہ آگے پل دھڑ ادھڑ جل رہا ہے اور تیز رفتار گاڑی چلی آ رہی ہے۔ میں دونوں ہاتھ پھیلا کر پٹری کے درمیان کھڑا ہوں اور چلا چلا کر کہہ رہا ہوں ''گاڑی روکو گاڑی روکو' آگے پل جل رہا ہے'' اور عازم سفر سواریاں جھلا جھلا کر کہہ رہی ہیں اس بیوقوف اور احمق دیہاتی کی آواز پر کان نہ دھرو یہ ترقی کا دشمن اور پیشروی اور حرکت کا بیری ہے! .... میری ساری انسانیت سے دردمندانہ درخواست ہے اور دست بستہ اپیل ہے کہ چونکہ ترقی کی اس گاڑی کو ہر حال میں روح کے پل پر سے ہو کر گزرنا ہے اور روح کا پل جل رہا ہے پہلے اس پل کا بندوبست کر لیں۔ ہم نے ذرّے کا جگر چیر کر ایٹم کے اندر کا راز تو معلوم کر لیا اب روح کے ایٹم کا تجزیہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے ساری سائنس اور ساری ٹیکنالوجی انسان کے لئے اور انسان کی فلاح کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ لیکن اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کے مقابلے میں انسان کو اور اس کی روح کو اور اس کی اندرونی طلب کو کوئی اہمیت نہ دی گئی تو پھر اس ساری ''ترقی'' اور ''پیش روی'' کا بڑا ہی خوفناک نتیجہ نکلے گا .... اگر انسان ظالم ہے، مکار ہے جھوٹا ہے اور بے انصاف ہے اور وہ بوسینا میں انیائے کا بیج بو کر سائنس اور ٹیکنالوجی کے زور پر چاند پر پہنچ گیا ہے کہ چاند کی سرزمین میں اپنے اعمال اور افکار کی کاشت کرے تو اس کی بوئی ہوئی فصل بوسینا کی کاشت سے کس طرح مختلف ہو گی۔

اس مادی دنیا میں روس کی گاڑی کا پہیہ اپنے پورے زور پر امریکہ اور مغربی ممالک کی مشترکہ سائنس اور ٹیکنالوجی سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ مجھے چونکہ روس سے بے پناہ محبت تھی اس لئے میں اس کی تیز رفتار گاڑی کے آگے دونوں ہاتھ پھیلا کر چیختا رہا چلاتا رہا کہ آگے پل جل رہا ہے۔ بھائی نبڑ بچ رہا ہے۔ ذرا ٹھہر جاؤ۔ ذرا رک جاؤ کہیں تمہارا نقصان نہ ہو

جائے۔ کوئی حادثہ رونما نہ ہو جائے ...... لیکن روس اپنی تیز رفتاری میں بہت آگے نکل گیا۔

میں اصلی ادیب تو نہیں بن سکا لیکن ایک چھوٹا رول تو کب کا اختیار کئے بیٹھا ہوں۔ میں اسی چھوٹے رول کے زور پر عمر بھر چیختا رہوں گا' چلاتا رہوں گا۔ واسطے دیتا رہوں گا کہ پہلے پل کی مرمت کر لیجئے پل ٹھیک کر لیجئے۔ روح کی پٹڑی استوار کر لیجئے پھر چاہے جس سپیڈ پر دل کرے آگے نکل جایئے۔ میں قربان! میں نہ آپ کے پہیئے کے خلاف ہوں نہ گاڑی کے نہ ترقی کے خلاف ہوں نہ تیز رفتاری کے۔ بس ایک توجہ چاہتا ہوں کہ چونکہ اس پل پر سے گزرنا لازمی ہو گیا ہے اس لئے پہیہ روک کر پہلے پل کا معائنہ کر لیں۔

پیر فقیر اور ملا' ہم پڑھے لکھے' دانشوروں' بیوروکریٹوں' یو این او کے نمائندوں اور وائٹ ہاؤس کے ترجمانوں کے مقابلے میں ضرور کثیف اور آلودہ لوگ ہوتے ہیں لیکن وہ اپنے اپنے علاقے کی بیشتر آبادیوں کی روحانی ضرورتوں کو اپنی پرانی روش اور اپنی لوک دانش سے پورا کرتے رہتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ان کو جینے کا حوصلہ بھی بخشتے رہتے ہیں ...... جب تک روح کی پرورش کا کوئی بہتر طریقہ اور بہتر سلیقہ اور مذہب سے زیادہ مہربان اور تصوف سے زیادہ حقیق پیدا نہ ہو جائے یا آپ کو مل نہ جائے تب تک بے اختیاری کے عالم میں صرف ''موجود'' کے سپرد ہو کر زندگی بسر کرتے چلے جانا میرے نزدیک کافی نالائق فیصلہ ہے۔

میرے ڈرامے ''سائیں اور سائیکرسٹ'' کو ایک مرتبہ پھر دیکھیں اور ساتھ کچھ دوستوں کو بٹھا کر بھی دکھائیں۔ پھر آپ جو فیصلہ کریں مجھے منظور ہوگا۔

پہلے پہل جب گلیلیو نے کہا ''زمین گھومتی ہے'' تو سب نے پکڑ کر اسے مارا کہ گدھے کے بچے! اگر زمین گھومے تو ہم گر نہ پڑیں۔ ہمارے رخ نہ بدلتے رہا کریں۔ ہمارا سر نہ چکرانے لگے۔ جب وہ نہ مانا تو اس کو پکڑ کر جلتی چتا پر بھسم کرنے کے لئے لے گئے پھر وہ ڈرا اور رویا!

☆ کچھ لوگوں کا یہ خیال بھی ہے کہ آپ Delusion of Grandeur میں مبتلا ہیں اور اردو ادب میں اسی مقام و مرتبہ کے متمنی ہیں جو انگریزی میں شکسپیئر کو حاصل ہے؟

☆☆ یہ ایک چھوت کی بیماری ہے جو تقریباً سارے فنکاروں میں ہوتی ہے اور اس وبا کا چلنا سارا سال ہی رہتا ہے۔ اس کے خطرناک مریض وہ لکھاری بھی ہوتے ہیں جو بظاہر عاجزی' انکساری اور ہیچمدانی، کا اظہار کرتے رہتے ہیں اور اندر اپنی انا کے تاج محل کو صبح و شام

پالش کرتے رہتے ہیں۔ یہ بیماری عام ہے اس کو ہم ادب کی زبان میں ''تعلّی'' کہتے ہیں۔

جو ادیب اپنے نام کو اور اپنی ذات کو اخفا میں رکھ کر لکھتا ہے اور عمر بھر اپنا آپ ظاہر نہیں ہونے دیتا وہ اس سے مبرا ہو سکتا ہے لیکن جو ایک مرتبہ رونمائی کی کرسی پر بیٹھ گیا تو اس Delusion میں مبتلا ہو گیا۔ اب میں کیا کروں!

☆ ایک تاثر یہ بھی ہے کہ آپ جس بلیغ انداز میں مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں ان کا حل یا ان مسائل کے ذمہ دار لوگوں کی نشاندہی سے کتراتے ہیں؟

☆☆ ادیب کا کام مسائل کی نشاندہی کرنے تک ہوتا ہے وہ مسائل کے ذمہ دار لوگوں کی طرف اشارے بھی کرتا ہے لیکن اس کا انداز محتسب اور ایڈیٹوریل رائٹر سے مختلف ہوتا ہے۔ ادیب کسی خاص فیوڈل لارڈ کے خلاف نہیں لکھے گا وہ ''فیوڈل ازم'' کے زہر کی نشان دہی کرے گا۔ یہ فیوڈل ازم چاہے خود ادیب میں ہو یا شاعر میں' فلسفی میں ہو سوشلسٹ لیڈر میں ہو' دینی راہنما میں ہو ادیب اس کے ہمہ گیر ضرر سے آشنا کرے گا تاکہ پڑھنے والا مختلف گرہوں میں اس مزمن مرض کو تلاش کر سکے۔ (خود اپنی ذات میں جھانک کر اپنے فیوڈل لارڈ سے متعارف ہو سکے) لیکن اس کے مقابلے میں ایک سیاستدان' صحافی اور محتسب ایک مخصوص گروہ کو فیوڈل ازم کا نمائندہ قرار دے کر اسے چٹی سے پکڑ کر سب کے سامنے پیش کرے گا کہ بس یہی خرابی کی جڑ ہے باقی سب خیریت ہے۔ اسے پتھر مارو۔ میں ٹھیک ہوں اور میں ہی سچا ہوں۔

☆ آپ کی زندگی میں تصوف کا بہت دخل ہے جبکہ آپ کے انتہائی قریبی دوست قدرت اللہ شہاب مرحوم جنہیں آپ' بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی بزرگ مانتے ہیں وہ تصوف کے حق میں نہ تھے ان کا کہنا تھا کہ تصوف محض کنڈرگارٹن کی حیثیت رکھتا ہے؟

☆☆ ممتاز مفتی' بانو قدسیہ اور میں' شہاب صاحب کو بزرگ مانتے ہیں فرق صرف اتنا ہے کہ قدرت اللہ شہاب میرا دوست بھی تھا اور دوستی میں کچھ چھوٹ ایسی بھی مل جاتی ہے جو عام حالات میں نہیں ملتی۔

شہاب صاحب تصوف کے زبردست قائل تھے اور انہی کی بدولت ہم کو اس راہ کی چٹک لگی (گو منزل ہماری قسمت میں نہ تھی) وہ اسی کے سہارے اور اس سیڑھی (تصوف) کے راستے شرع شریف تک پہنچے۔ واقعی تصوف دین کا کنڈرگارٹن ہے۔ یعنی جب تک آپ پرائمری میں داخل نہیں ہوں گے میٹرک نہیں کر سکیں گے۔ کچھ خوش نصیب البتہ ایسے ہوتے ہیں جو پرائمری پاس کئے بغیر سیدھے بڑی جماعت میں داخل ہو جاتے ہیں وہ بہت ہی قسمت

والے ہوتے ہیں۔ ان کا تانتا سید ھا مل جاتا ہے۔ وہ پہلی رکعت سے ہی خضوع وخشوع کے راستے دین کے عمل میں صحیح طریق سے شامل ہو جاتے ہیں۔ آخری منزل وہی ہے جو شارع اسلام نے متعین کی ہے۔ اب راستہ طے کرنے والا کسی کا ہاتھ پکڑ کر مسافت طے کرے یا سیدھے سبھاؤ کر لے یہ اس کی اپنی برات ہے۔ اپنی اپنی قسمت ہے اپنا اپنا لہنا ہے۔

شہاب صاحب کا تصوف سے وابستگی کا علم ان کی کتاب ''شہاب نامہ'' پڑھ کر بخوبی ہو جاتا ہے۔ اسے توجہ سے پڑھیے اور ان پر گزری ہوئی منفرد واردات کا خصوصی مطالعہ کیجیے۔

☆ علم کے بارے میں آپ کی رائے واضح نہیں مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ آج تک کسی ان پڑھ نے پاکستان کونقصان نہیں پہنچایا کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ فساد کی جڑ علم یا صاحب علم لوگ ہیں؟

☆☆ اس موضوع پر میں کئی بیان کئی جواب اور بہت سے جواب دعوے رقم کر چکا ہوں جو یقیناً آپ کی نظر سے گزرے ہوں گے۔ عرض یہ ہے کہ ایک علم غیر نافع ہے اور ایک علم نافع۔ حضورؐ نے علم نافع حاصل کرنے کی دعا فرمائی ہے اور ہمارے دین میں علم نافع ہی علم قرار پایا ہے۔ جس سے مخلوق خدا کو فائدہ پہنچے اور جس کی بدولت انسانوں میں آسانیاں تقسیم کی جا سکیں ...... اگر تو آج کے صاحبان علم بوسنیا میں صومالیہ میں کشمیر میں فلسطین میں آسانیاں تقسیم کر رہے ہیں تو پھر تو ہمیں یہی علم حاصل کرتے رہنا چاہئے لیکن اگر یہاں کوئی خرابی واقع ہو رہی ہے تو اس پر غور ضرور کرنا چاہئے اور اگر اس سے پلٹنے کی ضرورت ہو تو پھر پلٹنا بھی ضرور چاہئے۔

میں تو نہیں کہتا البتہ لوگ مل جل کر کئی مرتبہ بیوروکریسی سیاست دانی' تھانے کچہری' ہارس ٹریڈنگ' بوٹی مافیا وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں تو میں ان کو منع کرتا ہوں کہ آپ علم کی تذلیل نہ کریں یہ سارے پڑھے لکھے لوگ ہیں اور ملک اور قوم کا سرمایہ ہیں۔ ان کی بجائے ان لوگوں کی ندا کریں جو ان پڑھ ہیں اور کھیتوں' کھلیانوں' فیکٹریوں' سڑکوں' شاہراہوں وغیرہ میں کام کرتے ہیں اور جن کی نااہلی کی بدولت ساری دنیا' پورا کرۂ ارض مصیبت کی دلدل میں پھنسا ہوا ہے۔

علم نافع بہت بڑی دولت ہے اور صاحب علم ہونا اس کائنات کی سب سے بڑی سعادت ہے۔ میرے بابا جی سائیں نور والے فرمایا کرتے تھے کہ'' صاحب علم وہ ہوتا ہے جو مشکل کے وقت جماعت میں سب سے آگے ہو اور جب انعام تقسیم ہونے لگے تو جماعت میں

سب سے پیچھے ہو''

☆ تہذیب وثقافت کے بارے بھی آپ کا نظریہ مبہم ہے آپ معاشرتی برائیوں مثلاً سرعام پان کی پیک یا نسوار تھوکنا' سگریٹ' بیڑی سے آلودگی پھیلانا' نظم وضبط کی پابندی نہ کرنے کو ثقافت گردانتے ہیں؟

☆☆ کاش یہ سوال بنانے سے پیشتر آپ نے کسی ماہر معاشیات سے رجوع کرلیا ہوتا۔ تہذیب وثقافت کسی ایک انسانی گروہ کے اس اجتماعی افعال وکردار کا نام ہے جس کے فریم ورک میں رہ کر وہ دوسرے گروہوں کے دور نزدیک زندگی کے عمل سے گزر رہا ہوتا ہے۔ اس میں اچھائی' برائی' خوبی' خرابی کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً انگریز اپنے کام کے حصول کے لئے ''کیو'' لگاتا ہے۔ اطالوی بالکل نہیں لگاتا۔ اس میں اچھائی' برائی کی بحث نہیں۔ کلچر کے اختلاف کی نشان دہی مطلوب ہے۔

یہ میرا ایک درسی لیکچر تھا جس کا آپ نے حوالہ دیا۔ میں نے طالبعلموں سے کہا تھا کہ پان کی پیک دیواروں پر پھینکنا۔ راہ چلتے آوازیں کسنا' نسوار کی پچکاریاں چھوڑنا' پیار سے گندی گالیاں دینا ہماری بودوباش کا ایک بیّن حصہ ہے۔ یہ ہمارے کلچر کا ایک نمایاں پہلو ہے۔ میں اس وقت خرابی کی بات نہیں کررہا جو'' ہے'' اس کا ذکر کررہا ہوں۔ جب کبھی حفظان صحت کے حوالے سے یا اخلاقیات کے رشتے سے بات ہوگی اس وقت میں اس بودوباش کے بیّن حصے پر ایک اور زاویے سے روشنی ڈالوں گا۔ میں ''اچھا کیا'' اور ''برا کیا'' کی بات نہیں کررہا جو موجود ہے اس کا ذکر کررہا ہوں............

میرا خیال ہے اس بیان کی رپورٹنگ میں کچھ غلطی ہوگئی جس کا آپ کی طبیعت پر بوجھ پڑا۔

☆ آپ نے بیٹھے بٹھائے علامہ اقبال کو دو حصوں میں تقسیم کیوں کرڈالا یعنی آپ کہتے ہیں کہ دن کے اقبال کی نسبت رات کے اقبال کا زیادہ مداح ہوں؟

☆☆ ہر بڑے آرٹسٹ اور ہر بڑے تخلیق کار کے اندر Paradox کا رویہ موجود ہوتا ہے۔ ایک طرف وہ تعقل کا گرویدہ ہوتا ہے اور فکرودانش کے سہارے تخلیقی عمل میں اترتا ہے۔ دوسری جانب وہ تخیل اور جذبے کے زور پر اپنی تخلیق میں قوس وقزح کی اڑان سموتا ہے۔ اس اڑان میں اسے زندگی کے مناظر اور بھی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ایک رات ایسے ہی سرسری طور پر پیام مشرق کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے دل پر یہ بات گزری کہ حضرت علامہ بھی کیا خوش نصیب انسان تھے کہ کشف والہام کا زران کے سینے پر سے ٹھاٹیں مارتا ہوا گزر

بتاتا تھا اور وہ عقل کو چراغ راہ بنائے بغیر اپنی منزل تک پہنچ گئے تھے۔ پھر مجھے ان کے خطبات کا خیال آیا جو انہوں نے بڑی عرق ریزی سے دقیق حوالہ جات کی روشنی میں مرتب کئے تھے اور اسلامی فلسفے کی ان باریکیوں کو ایسے سلیقے سے بیان کر گئے تھے کہ تہذیب نوی کے ہر فرزند نے انہیں دل و جان سے پسند کیا تھا۔ ان کی شاعری سراسر عشق نظر آئی اور ان کے لیکچر عقل و خرد کی قابل عمل دستاویز۔ میرے ذہن میں دونوں پلڑے ترازو کے تول تل گئے اور میں جذباتی طور پر شاعری والے پلڑے کے زیادہ قریب آ گیا۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ جب حضرت علامہ واردات و کیفیات سے گزرتے ہیں تو ان کا ایک انوکھا رنگ ہوتا ہے اور جب وہ فلسفے کی گتھیاں سلجھاتے ہیں تو ایک دوسرا پہلو ہوتا ہے...... میری طرح اور بہت سے لوگ عشق والے اور جذبے والے شاعر اقبال کو جانتے ہیں اور اسی کی محبت میں مبتلا ہیں۔ اسی محبت کے راستے وہ خطبات والے حضرت علامہ تک پہنچتے ہیں۔ وہ تو شاید نہیں لیکن میں ضرور سوچتا ہوں کہ اگر حضرت علامہ نے ایک فلسفی کی حیثیت سے صرف لیکچرز لکھے ہوتے تو ان کا مقام کیا ہوتا اور اگر صرف شاعری کی ہوتی تو ان کی عظمت کس طرح کی ہوتی۔

بہر کیف یہ میری ایک سوچ بلکہ میری ایک کیفیت ہے اور ایسی کیفیت میں مبتلا ہونا آئین جمہوریت کے خلاف نہیں ہے اس لئے آپ مجھے آسانی سے معاف کر سکتے ہیں۔

☆ گزشتہ دنوں ایک خبر نظر سے گزری جس میں آپ نے سفیر یا سینٹر بننے کی خواہش کا اظہار کیا تھا آپ کا یہ مطالبہ اپنی ذات تک محدود ہے یا آپ ملک کے ممتاز اہل قلم کو اس اعزاز کا مستحق گردانتے ہیں؟

☆☆ اس خبر کی رپورٹنگ بھی ادھوری رہ گئی۔ ان دنوں صدر پاکستان کی سیٹ خالی ہونے کی بھی افواہ تھی تو میں نے اپنے آپ کو سب سے پہلے صدر پاکستان بننے کے لئے پیش کیا تھا اور اس اعزاز سے رہ جانے کی صورت میں سفیر اور سینٹر کی آسامی کو ہی منظور کر لیا لیکن ہمارے یہاں چونکہ طنز و مزاح سے لطف لینے کا خانہ خالی ہے اس لئے آپ کی طرح اور لوگوں کو بھی یہ بات پسند نہ آئی۔ بہر کیف میں نے ان تینوں ملازمتوں کو حاصل کرنے سے پہلے ہی اپنا استعفیٰ گزار کر دیا ہے۔ امید ہے منظور ہو جائے گا۔ لیکن میرے خیال میں اگر ملک کے صدر، سفیر اور سینٹر ادیبوں سے چنے جائیں تو وہ ملک و قوم کے لئے بہتر ثابت ہو سکتے ہیں۔ واللہ اعلم

☆ اگر ادیب یا شاعر کسی نظریے سے شدید وابستگی رکھتا ہو تو اس کی حیثیت اور تخلیق کو غیر جانب دار تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

☆☆ مغربی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد یہ احساس ہوا کہ عیسائیت سے شدید وابستگی کے باوصف وہاں کے شاعر اور ادیب اپنے آپ کو اور اپنی تخلیق کو غیر جانبدار اور لبرل شمار کرتے ہیں۔ آپ ٹی ایس ایلیٹ' دوستوفسکی اور ٹالسٹائی وغیرہ کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ ان کے ساتھ بے شمار ماڈرن رائٹر اور بھی ہیں جو اپنے مذہب سے بلاخوف تردید وابستہ ہیں۔ مشکل صرف تھرڈ ورلڈ میں مسلمان ادیبوں کو درپیش ہے کہ وہ اسلام سے اپنی وابستگی کو چھپا کر چلنا چاہتے ہیں تاکہ ان پر جانب داری کا یا رجعت پسندی کا ٹھپہ نہ لگ جائے۔ دنیائے اسلام کا رائٹر سلمان رشدی بننے کو تو تیار ہے لیکن ڈپٹی نذیر احمد یا نسیم حجازی بننے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ "بنیاد پرست" نہ کہلوانے کے لئے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہے۔ لیکن اب زمانہ کروٹ بدل رہا ہے۔ اب کی شوگر کوٹڈ گولیاں کسی کام نہیں آئیں گی۔ اب تو یا ادھر یا ادھر اب ماسک پہن کر کسی کو لبھایا نہیں جا سکے گا۔ اگر وابستگی ہوگی اور سچی ہوگی تو ادیب کی شخصیت میں بھی در آئے گی اور اس کی تخلیق میں بھی۔ اب آنے والے خطرات مسلمان ادیب کو "ریڈیکل" نہیں رہنے دیں گے۔ اس کی وابستگی ہر ہر قدم پر اس کا راز افشا کرتی چلی جائے گی اور وہ خوف سے براور ہوتا جائے گا۔ یہ راز اس نے حال ہی میں عیسائیت سے سیکھا ہے جس نے بوسنیا کے معاملے میں یو این او کو مظلوم Imbargo امبارگو لگانے کا حکم دیا اور الجزائر میں جمہوریت آ جانے پر جمہوریت کے نکتہ دانوں نے وہاں جبر کر کے مارشل لاء لگوا دیا ہے۔

یہ دور سانپ کے مرنے کا ضرور ہے لیکن اس میں لاٹھی بچانے کی صورت نہیں۔ اب بے زبان ان پڑھ دنیا' اپنا دین ایمان بیچنے والے فاضلوں کی رمزیں بہت خوبی سے سمجھنے لگی ہے۔ اگلا دور منافق دوستوں کے مقابلے میں سچے بنیاد پرستوں کا ہوگا لیکن اس میں پھر میرا قصور ہوگا۔

☆ بنی نوع انسان کی فلاح کے لئے سائنس کے مقابلے میں ادب کا مقام یا مستقبل کیا ہے؟

☆☆ سائنس انسان کی بڑی محسن ہے۔ اسی نے انسان کو تھکنے سے بچایا ہے اور ہر طرح سے اس کے جسم کی حفاظت کی ہے۔ پھر اس نے انسان کو جسمانی کلفتوں اور مشقتوں سے نکال کر اسے فرصت' فراغت اور آسودگی عطا کی ہے۔ اب آگے یہ سوچنا انسان کا کام ہے کہ وہ یہ فرصت فراغت اور آسودگی کس طرح سے استعمال میں لائے۔ عیاشی' آوارہ گردی' پریشاں نظری اور نکمے مشاغل اختیار کر کے یا ادب اور مذہب کو اختیار کر کے (ویسے ادب

مذہب ہی کی ایک شاخ ہے۔ جس طرح مصوری، بت تراشی، رقص، فنِ تعمیر، خطاطی، موسیقی، حُسن اور جمال کے دوسرے مظاہر ہی کی بدولت وجود میں آئے) جب انسان کو یہ سمجھ آ گئی کہ سائنس کی لونڈی ہمارے کام کاج سنوار کر صرف ہمارے جسم کی افزائش اور آسودگی کے لئے بنی ہے تو پھر وہ ضرور ادب کی طرف بھرپور توجہ دے گا۔ ایک ادب ہی کیا دوسرے سارے فنونِ لطیفہ کی طرف توجہ دے گا، فی الحال تو وہ اپنی بدنی آسائش سے ایسا مسرور ہوا ہے کہ اُسے روح کی بالیدگی کی پرواہی نہیں رہی۔

(ماہنامہ چہارسو، راولپنڈی، دسمبر ۱۹۹۳)

☆☆☆☆☆☆
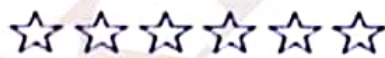
ادب کی آبرو

کے بعد

دیویندر اِسر

کی پیشکش

نئی صدی اور ادب

صفحات: ۱۹۲

قیمت: ۱۲۰روپے

پبلشرز اینڈ ایڈورٹائزرز ایف 14/21 (ڈی) کرشن نگر، دہلی

احمد عقیل روبی

سنتیاگو، بھیشم پتامہ اور اشفاق احمد

(Old Man and sea) کا بوڑھا سنتیاگو اور مہابھارت کا بھیشم پتامہ اور "داستان سرائے" کے اشفاق احمد تینوں ایک ہی مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ تینوں کی عادات ایک، شکل و صورت ایک، رویہ برتاؤ سمجھو ایک۔ بس فرق صرف حسب نسب اور عقیدے کا تھا۔ تینوں کی ایک عادت، ہر عقیدے ہر فریب اور ہر ذات پات کی نفی کرتی تھی۔ اور وہ تھی۔ اپنی ذات سے ہجرت اور دوسرے کے دل میں رہائش پذیر ہونا......!

سنتیاگو نے اپنا سارا تجربہ، ساری دانش، سارا علم چھوٹے سے لڑکے (Jim) کے دل میں اتار دیا۔ اسے چھوٹی بڑی مچھلی کی خاصیت بتائی، پکڑنے کے گر سکھائے، گرم سرد سمندر کی لہروں کے مزاج سے جم (Jim) کی آشنائی کرائی اور اسے سکھایا کہ طوفان کے سامنے سینہ تان کر کیسے انسان اپنی من مانی کر سکتا ہے۔

مہابھارت کے بھیشم پتامہ..... کوروں اور پانڈوں کے گرو، استاد اور رشتے دار۔ دنیاوی علم اور دھرم مذہب کے گیان کا مرکب پرش تھے۔ انہوں نے گیان دھیان اور بدھی مت دینے میں کوروں اور پانڈوں کے درمیان امتیازی لکیر نہیں کھینچی۔ دونوں ہاتھوں سے دونوں کو دان دیا۔ دونوں کو ایک دوسرے پر فوقیت پراپت کرنے کے داؤ پیچ سکھائے۔ بھیشم پتامہ کو اپنے مرنے کا دن بھی پتہ تھا۔ چنانچہ مہابھارت یدھ میں وہ اٹھارہ دن تیروں کے بستر پر لیٹے رہے اور جنم، فلسفہ، کرم، دھرم، زندگی، موت، نرک، سورگ کے بھید کھولتے رہے اور سب کچھ دان کر کے پرلوک سدھارے۔

اشفاق احمد خان نے ساری زندگی فہم و ادراک پڑیوں میں باندھ کر بانٹنے کا کاروبار کیا۔ یونان کے مشائی فلاسفروں کی طرح خان صاحب نے ٹیک ٹیک کے علم و دانش کی راکھ کریدی اور تہہ میں چنگاریوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر اشلوک کی پھونک مار کر سلگایا اور اپنے ارد گرد بیٹھے لوگوں کے سامنے

یوں روشنی کی کہ چھوٹے، بڑے، بچے، بوڑھے، مرد، عورت سب کے چہرے روشن ہو گئے۔

اشفاق احمد خان نے زندگی کی ترازو کے دو پلڑوں میں دین اور دنیا دونوں کو متوازن رکھا...... یہ شروع کی بات ہے جب وہ پینٹ کوٹ، ہاف بازوؤں کی بوشرٹ پہنتے تھے۔ ٹائی لگا کر ٹی ہاؤس میں بیٹھ کر قدیم اور جدید افسانے پر بحث کرتے تھے۔ زندگی کے اس روپ کو اشفاق احمد نے بڑے بھرپور انداز میں رچایا۔ ملک ملک کی سیر کی۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا۔ اٹلی، روم، برطانیہ، امریکہ سب چھان مارا مگر گھر سے نکلا ہوا یہ مسافر گھر کا رستہ نہیں بھولا۔ مٹی کا بنا یہ انسان کندن بن کر گھر لوٹا...... گاڑی قدرت اللہ شہاب کے سٹیشن پر رکی اور اشفاق احمد اور ممتاز مفتی دونوں بغیر ٹکٹ گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ٹکٹوں والے راستے میں رہ گئے۔ بغیر ٹکٹ منزل پر پہنچ گئے۔

اشفاق احمد کا "گڈریا" افسانہ پڑھ کر میں تو میں سارے اردو دان ان کے دیوانے ہو گئے تھے۔ ان سے مل کر زندگی مسکرا اٹھتی تھی۔ ان کے پاس بیٹھ کر روح تسکین پاتی تھی اور کہتی تھی۔

"اب کہیں اور کہاں جانا۔ ساری عمر یہیں بیٹھے رہو۔"

میں، ممتاز مفتی اور اشفاق احمد کو بہت دیر کے بعد ملا۔ یہ میری بدنصیبی تھی لیکن جب ملا تو نہ ملنے کا سارا گلہ جاتا رہا۔ انہوں نے چند دنوں میں اتنا کچھ دے دیا کہ جو شاید سالہا سال ملنے والوں کو نہ ملا ہو ممتاز مفتی سے چند بھرپور محفلیں ہوئیں تو ایک دن کہنے لگے۔ "......یار روبی...... توں مینوں ملیا او دوں ایں جدوں میں ٹکٹ کٹا کے گڈی دا انتظار کر رہیا واں......"

لیکن اس تیزی اور جلدی میں بھی انہیں اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی بہت فکر تھی۔ فیصل ٹاؤن والے اللہ لوک محمد افضل سے کہتے رہتے تھے......

"یار افضل میری بات چھوڑ، تو بانو قدسیہ اور اشفاق احمد پر کوئی پکا دم کر...... مجھے ان کی بہت فکر ہے"

مفتی کو اشفاق، بانو کی فکر رہتی تھی اور اشفاق احمد کو مفتی کی...... مفتی اشفاق احمد کی تخلیقی صلاحیتوں کے بڑے قائل تھے اور اکثر کہتے تھے۔

"اشفاق احمد شوبز کا بہت بڑا نام ہے اس کے ہاتھ لوگوں کی نبض پر ہیں۔ وہ لوگوں کو وہی کچھ دیتا ہے۔ جو وہ چاہتے ہیں لیکن وہ لوگوں کو بھیڑوں کی طرح اپنے راستے پر لے آتا ہے......"

"کیسے؟" کسی نے پوچھا۔

مفتی نے تولئے کے ٹکڑے سے اپنے ہونٹ صاف کر کے کہا۔

"تلقین شاہ کے ایک پروگرام میں تلقین شاہ ہدایت اللہ کو مشورہ دیتا ہے کہ مالٹوں کے جتنے چھلکے

ہیں وہ سارے کسی کے گھر کے سامنے پھینک آؤ۔ اپنے گھر کے سامنے پھینک کر گندنہ پھیلانا۔ لوگوں نے رات کو یہ پروگرام ریڈیو پر سنا۔ صبح اشفاق احمد دفتر جانے کے لئے گھر سے باہر نکلا تو اس کے گھر کے سامنے پورے محلے نے مالٹوں کے چھلکوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔" مفتی یہ بات سنا کر غصے میں آ گئے اور کہنے لگے۔

"اشفاق نے شو بزنس میں بڑا نام کمایا، بڑے جھنڈے گاڑے، لیکن "گڈریا" کے افسانہ نگار کو زہر دے دیا۔ بے وقوف کہیں......"

"گڈریا" ہر عہد میں پسند کیا گیا۔ یہ ایک چونکا دینے والا افسانہ تھا۔ بقول ایک نقاد اس کو پسند کرنے والوں کی تعداد 98% ہے۔ صرف دو فیصد لوگوں کو شاید پسند نہ آیا ہو۔

افسانے میں منفرد شہرت اور نام کمانے کے بعد اشفاق صاحب ڈرامے کے میدان میں اترے تو ایک اسلوب اور (Trend) قائم کر دیا۔ یونانی المیہ نگاروں کی طرح ڈرامے میں فہم و دانش کی پھولچیاں لگا دیں۔ پہلے پہلے یہ مقصدیت لوگوں کو ذرا سا چونکاتی تھی لیکن پھر اشفاق احمد نے لوگوں کو اپنے پیچھے لگا لیا اور اپنی بات لوگوں کو سنائی۔ یونانی ڈرامہ نگار ایسکائی لیس سے ایک بار اس کے ایک ساتھی نے کہا:

"یار تم بڑی گہری اور کبھی کبھی ایسی باتیں کرتے ہو جو سر کے اوپر سے گزر جاتی ہیں۔" ایسکائی لیس نے مسکرا کر کہا۔

"..... میرا کام صرف ڈرامہ لکھنا نہیں۔ میرا کام یہ بھی ہے کہ میں لوگوں کو اپنی بات سنا کر ان کے سوچنے کی صلاحیت کو آگے بڑھاؤں، اس لئے کہ مصنف راستہ بھی تو دکھاتا ہے۔" اشفاق صاحب نے ساری زندگی یہی کام کیا۔ انہوں نے اپنے ڈرامے میں لوگوں کو دو دنیاؤں کی سیر کرائی۔ ظاہری اور باطنی منزل کی طرف جانے والے راستوں کی نشاندہی کی۔ اپنی باتوں سے نظروں میں چراغ جلائے اور دلوں میں پھول کھلائے۔

اشفاق صاحب ایک بھرپور آدمی تھے اور بے پناہ تخلیقی صلاحیت رکھنے والے لکھاری......! اس عہد میں ایسے آدمی ملنا محال ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ وہ عہد قدیم کے ان زریں تخلیق کاروں کا پتر جنم تھے..... ایتھنز کے کہانی کاروں کے جوہر اشفاق صاحب میں کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ کہتے ہیں یونانی المیہ نگار ڈرامہ لکھتا تھا اور اس میں کردار بھی ادا کرتا تھا...... اشفاق صاحب نے تلقین شاہ کا کردار ادا کر کے ان کی اس صفت کو دہرایا ہے...... یونانی ڈراموں میں کردار ادا کرنے والا اداکار ایک مستند تحقیق کے حوالے سے 30 یا 40 MASKS بدل بدل کر تیس چالیس کردار ادا کرتا تھا.....

خان صاحب نے بھی یہ MASKS اپنی جیب میں چھپا کر رکھے ہوتے تھے..... چور، ٹھگ، استاد، پروفیسر، موچی، پنکچر لگانے والا، سبزی منڈی کا بروکر، اچھی، بری، منافق، چغل خور عورت...... گھر میں اور باہر اور شخصیت رکھنے والا خاوند، وڈیرا، کسان، فقیر، درویش، منجھی پیڑھی ٹھوکنے والا سب خان صاحب کے سینے میں بولتے تھے اور خان صاحب حسب ضرورت ان کا MASK پہن کر لوگوں سے مخاطب ہوتے تھے..... اشفاق صاحب نے اپنی تحریروں کو ڈرائنگ روم اور POSH ماحول سے نکال کر Down to Earth ماحول سے روشناس کرایا اور اسلوب میں استعمال ہونے والی زبان کا ایک نیا Blend تیار کیا جو بیک وقت عوامی بھی تھا اور روحانی لب ولہجہ کی عکاسی بھی کرتا تھا۔ خان صاحب کا یہ انداز، یہ اسلوب، یہ لہجہ ان کا اپنا تھا۔ اس پر جس مصنف نے چلنے کی کوشش کی قلم سے کر بیٹھ گیا۔ ایک سطر نہ لکھ سکا۔ وہ اپنی طرز کے اپنی مثال آپ تھے..... ممتاز مفتی صاحب کا گلہ اور اعتراض اپنی جگہ، لیکن اشفاق صاحب نے شوبز کے حوالے سے جتنا ادب تخلیق کیا اور لوگوں کو متاثر کیا وہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے۔

ارسطو (Aristotle) نے اپنی تنقیدی کتاب (Potecs) میں کہا ہے کہ اچھا مصنف وہ ہے جو اپنی تحریروں میں کم سے کم نظر آئے۔ اس کی شخصیت کی چھاپ اس کی تحریروں میں نظر نہیں آنی چاہئے۔ یہ بات اس کی مقبولیت پر اثر انداز ہوتی ہے....."

لیکن اشفاق صاحب کی تحریروں میں ان کی شخصیت کا دور بولتا ہے۔ فقرے کی بندش، لہجہ کا سر تال کہتا کہ کہنے والا اشفاق احمد ہے اور ان کی مقبولیت دن بدن بڑھتی ہی چلی گئی۔ ان کی شخصیت کے سحر نے انہیں منفرد اور مقبول ترین مصنف بنا دیا۔ تحریر ہو یا تقریر وہ پڑھنے اور سننے والوں پر جادو کی چھتری سے ایک منتر پڑھتے تھے اور پڑھنے سننے والے بت بن کر انہیں دیکھتے اور سنتے تھے۔ شیا گو تحسیم پتامہ اور اشفاق صاحب میں یہی قدر مشترک تھی..... بڑی بڑی باتوں کو انہوں نے عام پیرائے میں بیان کر کے لوگوں کو اکٹھا کیا اور جب لوگ اٹھ کر گئے تو ان کا لب ولہجہ دیر تک دل کے آنگن میں گھنگرو بن کر بجتا رہا۔

اشفاق احمد خان ایک انسان نہیں تھے، ایک ادارہ تھے، ایک عہد تھے۔ ان کے لب ولہجہ میں ایک تہذیب، ایک ثقافت اور ایک عقیدہ سانس لے رہا تھا جسے انہوں نے مختلف "بابوں" کے حوالے سے لوگوں کے سامنے پیش کیا..... کچھ لوگوں کو شاید ان کے اس طرز اسلوب سے انکار ہو۔ اختلافی رائے بھی رکھتے ہوں لیکن ایسا کرتے ہوئے وہ ایک بات فراموش کر دیتے ہیں کہ ہر بڑا ادیب ایک مقصد، ایک عقیدے کا پرچارک ہوتا ہے۔ ہومر (Homer) ہو، ورجل (Virgil) ہو یا ملٹن

(Milton) سب نے اپنے اسلوب میں اپنے عقیدے کا تڑکا لگایا ہے ۔ ہومر کی کتابوں کا ہر باب پہلے ہومر کے عقائد اور نظریات سے شروع ہوتا ہے۔ بعد میں کہانی اور شاعری کے جوہر کھلتے ہیں...... شاعری اور اسلوب کو اس نے نظریات اور عقیدے کے فروغ کے لئے استعمال کیا...... یہی حال اشفاق احمد خان کے اسلوب کا تھا۔ انہوں نے عام انسان کا لہجہ اپنا کر روح اور عرفان کی باتیں کہیں ... اٹلی کے مشہور شاعر ورجل کو جب بادشاہ نے کہا کہ وہ ایک بڑی نظم لکھے جو قومی شاعری کی شکل اختیار کر جائے تو اس نے چھ ماہ پوری اٹلی گھوم پھر کر دیکھی تاکہ وہ عام آدمی کی زبان، عقائد اور ذہنی سطح کو جان سکے پھر اینی اڈ (Enied) لکھی۔

خان صاحب نے بھی محلات کی زبان سے دامن چھڑایا اور گلی بازاروں میں بولی جانے والی زبان کو وسیلہ بنا کر موضوعات کا ڈول ڈالا اور پھر ان کی ایک ایک بات عام انسان کے دل میں اتر گئی اشفاق احمد خان ایک جادوگر تھے جو اسلوب کی چھڑی ناظرین اور قارئین کے سر پر پھیر کر انہیں بت بنا دیتے تھے اور باتوں کی بارش سے شرابور کر دیتے تھے...... ایسا لکھنے والا اور بولنے والا صدیوں میں پیدا ہوتا ہے۔

(ماہنامہ ادب لطیف، لاہور، مئی ۲۰۰۵ء)

اشفاق نقوی

اشفاق احمد...... چند یادیں

یہ 1977ء کے اواخر کا ذکر ہے جب ایک طویل عرصہ پاک فضائیہ میں رہنے کے بعد میں ریٹائر ہو کر اپنے ماڈل ٹاؤن والے گھر میں رہنے آ گیا۔ فراغت کے ان دنوں میں وہ شوق یاد آنے لگے جو ملازمت کے دوران پورے نہ ہو سکے تھے۔ ان میں ایک مرغیاں پالنے کا شوق تھا۔ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی خاصی وسیع تھی لہٰذا اس کے ایک گوشے میں پنجرہ بنوانے کے بعد میں مرغیاں خریدنے کی فکر کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ ماڈل ٹاؤن کے قریب ہی دھالانا گاؤں میں بہت سے پولٹری فارم ہیں جہاں سے ضرورت پوری ہو سکتی ہے' بس پھر کیا تھا میں فوراً وہاں پہنچا اور پولٹری فارموں کا چکر لگا کر مرغیاں پالنے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے لگا۔ معاً ایک فارم کے مالک نے میرا نام پوچھ لیا' جب میں نے بتایا تو مزید پوچھنے لگا کہ آپ آئے کہاں سے ہیں؟ جب میں نے ماڈل ٹاؤن کہا تو وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ہنس کر کہا خیریت تو ہے' آپ پریشان معلوم ہو رہے ہیں۔ کہنے لگا کوئی خاص بات نہیں' بس ایک صاحب مرغیاں خریدنے ماڈل ٹاؤن ہی سے آتے ہیں اور ان کا نام بھی وہی ہے جو آپ کا ہے۔ خیر' میں مرغیاں خرید کر وہاں سے چلا آیا۔

میں نے اشفاق احمد کا نام تو سن رکھا تھا بلکہ ایک مدت سے ان کا پروگرام تلقین شاہ بھی سنتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے دوست اور پاک فضائیہ کے ساتھی مظفر علی سید سے ان کا ذکر سن رکھا تھا مگر ان سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ چند ہی دنوں بعد میں نے یہ شوق بھی پورا کر لیا۔

ہوا یوں کہ میرے ریٹائر ہوتے ہی پاک فضائیہ والوں نے اپنے سابق ملازمین کی فلاح کے لئے شاہین فاؤنڈیشن بنا کر اس کے تحت بہت سے کاروبار کرنے کی ٹھانی۔ اس سلسلے میں انہوں نے ایک اشتہاری کمپنی بھی بنائی اور اس کا مجھے جنرل منیجر مقرر کر دیا۔ اس کا دفتر لاہور چھاؤنی میں ایسی جگہ قائم ہوا جہاں سے قریب ہی میاں میر پل کے عقب میں اردو سائنس بورڈ کا دفتر تھا۔ اشفاق احمد ان

دنوں اس دفتر کے سربراہ تھے۔ بس ایک روز خیال آ گیا اور میں ان کے دفتر جا پہنچا۔ ان کے کمرے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ بیٹھے کچھ لکھ رہے ہیں، ممکن ہے ٹی وی کا ڈرامہ ہو، بہر حال بڑی شفقت سے پیش آئے۔ باتوں باتوں میں کہنے لگے میں بھی ماڈل ٹاؤن ہی میں رہتا ہوں۔ جب میں نے کہا کہ میری بیوی کا نام بھی قدسیہ ہے تو بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے کمال ہے، ہم دونوں بھی ہمنام اور ہماری بیویاں بھی ہمنام۔ رہتے بھی ہم دونوں ماڈل ٹاؤن ہی میں ہیں مگر ستم یہ ہے کہ ہماری ملاقات ہوئی ہے تو شہر کے اس کونے میں۔ دراصل ہم لوگ صرف سونے کے لئے ماڈل ٹاؤن جاتے ہیں۔

اس کے بعد تو اشفاق صاحب سے ملاقاتیں ہوتی ہی رہیں بلکہ یوں سمجھئے کہ انہیں جب بھی کسی تقریب میں شرکت کرنا ہوتی تو میں تمام کام چھوڑ کر ان کی دلچسپ باتیں سننے پہنچ جاتا۔ ان کی گفتگو کا طریقہ کچھ ایسا تھا کہ انسان اس کی طرف کھنچا چلا جاتا۔ مجھے یاد ہے محمد سعید شیخ کے یہاں ایک تقریب میں انہوں نے اپنے روم میں قیام والے قصے سنائے۔ ذکر تھا 1950ء کی دہائی کے اوائل کا جب وہ اٹلی کی یونیورسٹی میں اردو پڑھانے بھیجے گئے۔ کہنے لگے رفتہ رفتہ وہاں کے ایک خاندان سے مراسم پیدا ہونے تو میں ان کے گھر جانے لگا۔ ایک روز خاتون خانہ نے مجھے ایک بھورے رنگ کا مشروب پیش کیا اور ساتھ ہی بتایا کہ یہ امریکہ والوں کی حالیہ ایجاد ہے اور مزید یہ کہ اس کے پینے سے ہر مرض دور ہو جاتا ہے۔ کہنے لگے میں نے پیا اور وہ خوش ذائقہ بھی معلوم ہوا، میں نے اس کا نام پوچھا تو محترمہ کہنے لگیں کہ امریکہ والے اسے کوکو کولا کہتے ہیں۔

اس کے بعد اشفاق صاحب نے یہ بھی بتایا کہ انہوں نے کس طرح شیلی کی قبر کا سراغ لگایا اور ایک مقامی شخص کی مدد حاصل کر کے اس قبر کے پہلو میں لیٹ کر اپنی تصویر بنوائی، مگر اس شام انہوں نے اس دور کا سب سے دلچسپ واقعہ جو بیان کیا وہ ایک جلتے ہوئے گھر کے بارے میں تھا۔

کہنے لگے کہ ایک شام میں گزر رہا تھا کہ دیکھا ایک گھر شعلوں کی لپیٹ میں ہے اور اس کے باہر ایک عورت واویلا کر رہی ہے کہ اس کے دو بچے اندر ہیں۔ وہ ہر کسی سے التجا کر رہی تھی کہ اندر جا کر بچوں کو نکال لائے مگر کوئی ہمت کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اتنے میں ایک آوارہ سا شخص وہاں سے گزرا۔ اس نے عورت کی چیخیں سنیں تو فوراً شعلوں میں سے گزرتا ہوا مکان میں داخل ہوا اور بچوں کو بحفاظت نکال لایا۔ لوگوں نے اس کی بہت تعریف کی یہاں تک کہ شہر کی بلدیہ کے سربراہ نے اس کے اعزاز میں ایک جلسے کا اہتمام کیا تاکہ اسے بہادری کا انعام دیا جا سکے۔

کہنے لگے جلسہ ہوا اور پورا شہر اس شخص کو داد دینے پہنچ گیا۔ سٹیج پر بلدیہ کے سربراہ کے پہلو میں وہ شخص بھی بطور مہمان خصوصی موجود تھا۔ ابھی تقریریں ہو رہی تھیں کہ بلدیہ کے سربراہ نے اپنا

ہاتھ جیب میں ڈالا اور چیخ کر کہا کہ میرا بٹوہ غائب ہو گیا ہے' ساتھ ہی اس نے تمام حاضرین کو اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنے کو کہا تا کہ ان کی تلاشی لی جا سکے۔ تلاشی تو لی گئی مگر کسی کی جیب سے وہ بٹوہ نہ نکلا۔ اس پر مجمعے میں سے کسی نے آواز لگائی کہ مہمان خصوصی کی تلاشی بھی تو لو' مگر کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔

آخر میں بلدیہ کے سربراہ نے مہمان خصوصی کی بہادری کو سراہا اور اسے ایک گرانقدر تحفہ پیش کرتے ہوئے گلے سے لگالیا' ساتھ ہی اس نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو دیکھا کہ اس کا بٹوہ واقعی وہاں موجود ہے۔

اسی طرح میں ہر اس جگہ پہنچتا رہا جہاں اشفاق صاحب کے تقریر کرنے کا اہتمام ہوتا۔ ایک مرتبہ کہنے لگے کہ ہم اپنے لوگوں کی برائیاں کرتے ہیں مگر اس پاکستانی ٹیکسی ڈرائیور کی تعریف نہیں کرتے جو امریکہ میں ایک مسافر کا بھولا ہوا سامان اس کے گھر پہنچا آتا ہے۔ پھر ایک مرتبہ بسنت کا ذکر کرتے ہوئے کہنے لگے کہ لوگ یہ تہوار جوش و خروش سے اس لئے مناتے ہیں کہ اس میں لوٹ کا عمل شامل ہے یعنی اس چیز کو حاصل کرنے کا شوق جس پر اس کا کوئی حق نہیں۔ افسوس سے کہنے لگے کہ بدقسمتی سے یہ ہماری فطرت کا جزو بن چکا ہے۔

ایک تقریر کے دوران اشفاق صاحب نے افغانستان کے حالات پر بڑے دکھ کا اظہار کیا۔ کہنے لگے امریکہ والے کردار تو ڈاکو والا ادا کر رہے ہیں اور خود کو ظاہر کر رہے ہیں رابن ھڈ۔ مزید کہنے لگے کہ امریکیوں کے ضمیر نے تو انہیں اس وقت بھی نہ جھنجھوڑا جب انہوں نے جاپان کے شہریوں پر ایٹم بم پھینکا تھا۔

افسانوں کے بارے میں ایک تقریر کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ مصیبت یہ ہے ہمارے لکھنے والے کسی کردار کو اس کے اصلی روپ میں پیش کرنے سے گھبراتے ہیں۔ ان کی کوشش یہی ہوتی ہے کہ ایک بدکردار کو کہانی کے آخر میں نیک کردار بنا ڈالیں۔

اشفاق صاحب ٹی وی پر تو بار بار دکھائی دیتے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ وہ ٹی وی کے اکثر پروگرام خود بھی دیکھا کرتے تھے۔ میں نے ٹی وی کے لئے متعدد پروگرام لکھے مگر ذاتی طور پر شاید ایک یا دو مرتبہ ہی کیمرے کے سامنے پیش ہوا۔ اس سلسلے میں ایک مرتبہ میرے دوست پروڈیوسر سلمان سعید نے مجھے گھیر کر ایک پروگرام میں شرکت کرنے پر آمادہ کر لیا۔ یہ تراجم کے بارے میں مذاکرہ تھا۔ یہ پروگرام ریکارڈ تو ہو گیا مگر پیش اس وقت ہوا جب میں سو چکا تھا' مگر اگلے روز اشفاق صاحب سے ملاقات ہوئی تو اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے رات تو خوب ڈند نا رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ ادبی

پروگرام تھا اس لئے اشفاق صاحب نے خاص طور سے دیکھا۔

جس زمانے میں حسین مجروح حلقہ ارباب ذوق کا سیکرٹری تھا تو اس نے سینئر ادیبوں کی سالگرہ پر انہیں گلدستہ پیش کرنے کی روایت ڈال رکھی تھی۔ یہ گلدستہ پیش کرنے کے لئے حسین مجروح ایک سینئر ادیب کو بھی ساتھ لایا کرتا تھا۔ اس سلسلے میں جب میری سالگرہ ہوئی تو اشفاق صاحب گلدستہ پیش کرنے والوں کی قیادت کرتے ہوئے میرے یہاں تشریف لائے' اسی طرح جب ان کی سالگرہ آئی تو یہ فریضہ میں نے ادا کیا۔ اب نہ تو ان کی سالگرہ ہوگی اور نہ ہی مجھے اپنی اگلی سالگرہ کا یقین ہے۔

اظہر جاوید

نہ صوفی نہ پیر......صاحب بیان وتحریر

اشفاق احمد

ایک ولایت کے صوفی کے پاس دوسری ولایت کے صوفی آئے۔ رسمی علیک سلیک کے بعد آنے والے صوفی نے کسی تیسرے ولایت کے صوفی کا ذکر کیا کہ وہ آپ کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا اور کہتا ہے کہ آپ نے ڈھونگ رچار کھا ہے۔

بات سننے والے صوفی خاموش ہو گئے اور سر نیہوڑا لیا۔ بات سنانے والے صوفی نے کہا "حضرت جی! ایسی باتوں پر پریشان نہیں ہونا چاہیے، لوگ اسی طرح کہتے رہتے ہیں۔"

بات سننے والے صوفی نے سر اٹھایا اور کہا "واللہ، میں پریشان نہیں ہوا۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ میں نے ان صاحب کے ساتھ کیا نیکی کی تھی، جس کے بدلے میں وہ میرے خلاف بول رہے ہیں۔"

یہ حکایت مجھے اشفاق احمد کے بارے میں ایک تازہ چھپی ہوئی کتاب دیکھ کر یاد آئی ہے۔ اس کتاب پر دو مؤلفین کا نام ہے۔ اور اس میں مضمون بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک سراسر محبت سے سرشار اور اشفاق احمد کی عظمتوں کو خراج پیش کرنے والے، دوسرے نہایت نچلی سطح تک جا کر انہیں رگیدنے والے ہیں۔ پھر انہی دنوں ایک بے نام دشنام نامہ بھی گردش کر رہا ہے، جس میں اس بے دردی سے جھوٹ لکھا گیا ہے کہ لکھنے والوں سے نفرت اور اشفاق مرحوم سے عقیدت مزید بڑھ جاتی ہے۔ میں اشفاق احمد کو تین چار دہائیوں سے جانتا ہوں۔ وہ جو پنجابی میں کہتے ہیں نا "یار اوہیا جانے، یا واہ پیا" (یا تو بندے کا اصل ہم سفری میں سامنے آتا ہے یا اس سے کوئی کام آ پڑے تو۔!!) مجھے اشفاق صاحب کو دونوں انداز سے دیکھنے اور پرکھنے کا موقع ملا۔ مواقع ملے ہیں اور اس سے پہلے بھی جب وہ غریب قلم کار تھے، اور اپنے ہاتھ سے چھوٹی پرنٹنگ مشین چلا کر رسالہ "داستان گو" چھاپتے تھے اور کرایے کے گھر میں رہتے تھے۔ تب سے اب تک میں نے انہیں آسانیاں تقسیم کرتے ہی دیکھا ہے۔ اپنی عمر کے سارے برسوں میں بے شمار بڑے اہل قلم سے مل چکا ہوں اور کئی دوسرے نامور دانشوروں سے بھی شرف ملاقات ملا ہے۔ بہت کم ایسے ملے ہیں، جن کے لب پر کبھی شکوہ شکایت نہ آئی ہو۔ میں نے اشفاق احمد کو کسی کی شکایت کرتے یا "چغلی" کرتے کبھی نہیں دیکھا۔

جن صاحب نے اس کتاب میں اشفاق احمد کے خلاف مضمون لکھوائے ہیں، میرا ایمان ہے کہ زندگی کے کسی نہ کسی لمحے میں اشفاق احمد نے ان پر بھی کوئی نہ کوئی احسان کیا ہو گا۔ یا پھر کچھ کم ظرف لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے کہ وہ بغض للہی رکھتے ہیں۔ اپنے کسی نفسیاتی احساس (کمپلیکس) کی تسکین کیلئے وہ اپنے سے اچھے لوگوں کے ٹخنوں پر چٹکی لیں گے یا کنکر ماریں گے کہ اس طرح لوگ انہیں حیرت سے دیکھیں گے۔ کیا اشفاق احمد کا یہ کم احسان ہے کہ اس نے کسی ادبی گروہ میں شامل ہوئے اور ادب کے قبضہ گروپوں کے ساتھ سانجھ رکھے بغیر اتنا شگفتہ اور معنی آفریں ادب تخلیق کیا ہے۔ یہ کہانی کے حوالے سے ہو، ان کے ڈرامے کی پیش کش ہو، سفر نامہ ہو، شاعری یا تصوف کی باتیں۔ اشفاق احمد نے اپنے لئے کچھ نہیں کیا، انہوں نے عام آدمی کے درد اور محروم لوگوں کے کرب کو اپنی روح میں انڈیلا اور پھر اسے کوئی سا روپ دے کر پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دیا۔

ان کے ٹیلی ویژن کے پروگرام "زاویہ" کو بھی زد پر رکھا جا رہا ہے۔ اشفاق صاحب، کسی پر کچھ ٹھونستے نہیں تھے۔ انہوں نے زندگی کو جس رخ سے دیکھا، روحانیت کو جس طرح محسوس کیا اور تصوف کی واردات میں سے جیسے گزرے تھے، ان کیفیات ہی کا تو اظہار کیا تھا...... اب تو "زاویہ" عنوان سے کتاب بھی چھپ گئی ہے۔ میں ان کے مخالف کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ کہیں کسی ایک سطر سے، کسی جملے سے، یا بین السطور مطالب نکالنے کی سعی کرتے ہوئے یہ بتادیں کہ کہاں اشفاق احمد نے کہا ہے کہ وہی سب کچھ ہیں، وہی سوچ کا منبع اور آگہی کا محور ہیں۔ وہ تو کیفیات کو جس طرح خود ہی سموتے تھے، اسے صرف اپنے لفظ، اپنا لہجہ اور اپنا اظہار دیتے تھے۔ نہ صوفی ہونے کا دعویٰ نہ پیر بننے کا اعلان...... اچھا مان لیا کہ انہوں نے صوفی اور پیر اور ولی اللہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا تو اس سے کسی دوسرے کو کیا تکلیف ہو گی...... اشفاق احمد تو علم و ادب کے حوالے سے سامنے آئے ہیں، وہ بے شمار جاہل اور ان پڑھ لوگ جو دکان داریاں سجائے بیٹھے ہیں، ان کے خلاف کوئی کیوں نہیں بولتا۔

پرویز مشرف طنطنے سے کہتے ہیں کہ وہ صدر مملکت بھی رہیں گے اور وردی بھی پہنے رکھیں گے (کر لو جو کرنا ہے......) مولوی فضل الرحمٰن حکومت سے ہاتھ ملاتے ہیں اور متحدہ مجلس عمل اور حزب مخالف کے سر خیل بھی بنتے ہیں — کیا نام نہاد ادیبوں کے لئے یہ مسائل نہیں ہیں...... اور پھر جو خلاف لکھنے والے ہیں، ان کا اپنا قد کتنا اور ان کے معیار کی پرکھ کون کرے......؟ وہ جو کہتے ہیں نا......

ہر بوالہوس نے عشق پرستی شعار کی

جس کے جو جی میں آتا ہے، وہ ان سیدھا لکھ کر پیسے دے کر چھپوا لیتا ہے یا چھاپ لیتا ہے...... چونکانے والا عنوان رکھ لیں، تو ایسی لایعنی کتابیں تھوڑی بہت بک بھی جائیں گی، مگر وہ

کس کی خدمت کر رہے ہیں؟ عام پڑھنے والے پہلے ہی ادب سے دور ہوتے جا رہے ہیں، ایسی الم غلم تحریریں اور کتابیں پڑھ کر ادب اور ادیب سے ان کا اعتبار بالکل ختم ہو جائے گا...... تو کیا یہ سب ایک منصوبے کے تحت ہو رہا ہے؟

اشفاق احمد نے زندگی بھر لوگوں کی تعریف میں مضامین لکھے...... تقریروں میں اوروں کو سراہا...... وہ چاہتے تو اپنی ذات کو بھی نمایاں کر سکتے تھے...... انہوں نے سچ کہا تھا...... اس ملک کو پڑھے لکھے لوگوں ہی نے ضعف پہنچایا ہے...... ان پڑھ نے نہیں...... تلقین شاہ ہو یا زاویہ...... اس کو ادب کی کسوٹی پر چاہے بے شک جانچ لیں، مگر جتنے یہ پروگرام کم پڑھے لوگوں میں مقبول تھے، ان کا شمار ممکن نہیں...... وہ انہیں وعظ کے طور پر سنتے تھے...... مجھے ایک واقعہ یاد ہے...... جمیل الدین عالی کی کچھ...... زمین داری لاہور اور اوکاڑہ کے درمیان ہے...... عالی جی بھی مشہور آدمی ہیں اپنی شاعری اور کالموں کے حوالے سے اور اچھے سرکاری عہدوں پر رہنے کی وجہ سے بھی...... کئی سال پہلے وہ لاہور آئے تو اشفاق احمد کو ساتھ لے کر اپنی زمینوں پر گئے...... وہاں کہیں خود انہوں ہی نے اشفاق صاحب کا تعارف تلقین شاہ کے طور پر کروا دیا...... اب عالم یہ ہوا کہ ان کے سارے مزارعے، کمی کمین اشفاق صاحب کے گرد جمع ہو گئے اور چند لمحوں میں یہ خبر گاؤں اور قریبی ڈیروں تک پہنچ گئی تو لوگ جوق در جوق تلقین شاہ کا دیدار کرنے اور ان کی باتیں سننے کے لئے آنے لگے...... عالی جی کے لئے یہ کیفیت حیران کن تھی۔

میں اشفاق صاحب کے ساتھ ایک بڑی تقریب میں شرکت کے لئے دوبئی گیا...... تین دن میں یوں لگتا تھا کہ دوبئی ہی نہیں، ابوظہبی اور شارجہ کے لوگوں کے لئے کوئی اوتار آ گیا ہو...... تقریب کسی اور کے اہتمام میں تھی، منتظمین بھی ہکا بکا تھے کہ شہر میں کیا صرف اشفاق احمد ہی ہیں، کوئی اور نہیں...... ؟ کیا وہ لوگ کم عقل تھے...... جی نہیں، صرف تھڑدلے نہیں تھے اور حسد نہیں رکھتے تھے۔

اشفاق احمد کا مشاہدہ بڑا گہرا تھا...... وہ جزئیات جنہیں عام لوگ سرسری سا لیتے تھے، وہ اس کی ایک ایک رمز سے واقف ہو جاتے تھے۔ کئی برس کی بات ہے...... میں ان کے پاس بیٹھا تھا اور بات چائے سے ہٹ کر کولڈ ڈرنکس تک پہنچی میں نے کہا...... سکنجبین تو غائب ہی ہو گئی ہے...... صرف انار کلی میں ایک دکان رہ گئی ہے جہاں خالص سکنجبین ملتی ہے......

اشفاق صاحب نے فوراً ہنکارا بھرا...... "ہاں یار...... وہاں دو بابے بیٹھے ہوتے ہیں...... کس سلیقے سے وہ ہر بار نمک مل کر گلاس دھوتے ہیں، ان کے گھڑے کے ساتھ ہی نلکا ہے...... وافر پانی

سے گلاس صاف کرتے ہیں پھر نمبو کو کاٹتے ہیں، تھوڑی چینی، ذرا سا نمک ملاتے ہیں، ہاتھ دھو کر گاہک کو پیش کرتے ہیں۔"

میں حیران رہ گیا کہ میں جو اکثر وہاں جاتا تھا، میں نے یہ باریکیاں نہیں محسوس کی تھیں وہ تحیّر میں رہتے تھے اور تجسس رکھتے تھے، اور اسی کی سب کو تلقین کرتے تھے۔ آپ ان کے سامنے کوئی بات کریں کہ میرے پاس ایک موبائل فون ہے، اس کی یہ خوبیاں ہیں۔ وہ پوری حیرت سے آپ کی بات سنیں گے یوں جیسے کوئی بالکل انجان ہوں...... مگر کسی اور موقع پر بات ہوتی تو وہ موبائل فون کے موجد، اس سسٹم کے سارے بھید بھاؤ اور اس کی آگے ہونے والی ترقی پر ایسی ٹھوس معلومات دیں گے کہ میرے جیسا حیران رہ جاتا کہ کہاں وہ معصومیت اور کہاں معلومات کا یہ سمندر...... دراصل وہ کسی کی دل شکنی نہیں کرتے تھے۔ وہ حوصلہ بڑھاتے تھے اور بات کرنے والے کو یہ یقین دلاتے تھے کہ جتنا وہ جانتا ہے کوئی اور (خود اشفاق احمد بھی) اتنا نہیں جانتا یہ ان کے تجربے، مشاہدے، مطالعے اور تربیت کا فیضان تھا۔

انہوں نے ایک بار بتایا تھا...... جب وہ اٹلی میں اردو پڑھانے کے لئے گئے تو وہاں ایک روز یونیورسٹی کی لائبریری میں بیٹھے ہوئے ان کی ایک لیکچرار ساتھی خاتون نے پوچھا...... آپ مشرق سے آئے ہیں، وہاں تو جنات کی بڑی دھوم ہوتی ہے...... کیا آپ بھی اسے مانتے ہیں......؟

اشفاق صاحب نے بتایا...... وہ نوجوانی کی ترنگ اور اپنی ہمہ دانی کی سرشاری میں تھے...... انہوں نے خاتون کو پھٹ سے جواب دیا...... "سب غلط ہے، کچھ بھی نہیں، کیا جنات اور کیا ہوائی بلائیں، سب قصہ کہانی ہے۔ اشفاق صاحب کہنے لگے، وہیں ایک سینئر پروفیسر بیٹھے تھے...... شاید فلسفہ ان کا موضوع تھا...... کم بولتے تھے اور زیادہ پڑھتے رہتے تھے۔ ان پروفیسر نے مطالعے سے سر اٹھایا۔ اشفاق احمد کو دیکھا اور مخاطب ہوئے۔

"شاباش نوجوان پروفیسر...... آپ کتنے اعتماد سے ایک سوال کو رد کر رہے ہیں۔ ہمیں تو برسوں لگ جاتے ہیں، چیزوں کو جاننے، پہچاننے میں اور پھر کہیں جا کر اقرار یا انکار کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ آپ نے ایک پل میں فیصلہ کر دیا......"

اشفاق صاحب نے بتایا اس واقعے نے مجھے مہمیز کیا...... میں شرمسار تو ہوا، مگر پھر زندگی بھر چیزوں کی ٹوہ لئے اور کھوج لگائے بغیر کبھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا۔

یہ ریاضت مرتے دم تک ان کے ساتھ چلی تھی...... اور جو چیز انہیں کھب گئی، پسند آ گئی یا دل و جاں میں اتر گئی، اس کا چرچا وہ سرِعام کرتے تھے اور جس کو سراہتے تھے، وہ چاہے کوئی معمولی بندہ رہا ہو یا

لکھنے لکھانے میں اس کی زیادہ پہچان نہ ہو، اشفاق احمد اس پر نثار ہو جاتے تھے.....

یہ بات پہلے اسلم کولسری نے بتائی اور پھر اشفاق صاحب کی وفات کے بعد، بانو آپا نے اس کی توثیق کی' ... میرا ایک شعر انہیں تڑپا گیا تھا۔ برسوں کے تعلق میں، میں نے نہ کبھی انہیں شعر سنائے تھے نہ کبھی میں اپنے رسالے "تخلیق" میں اپنا کلام چھاپتا ہوں۔ اب جو 45،40 برس کے شعری سفر کے بعد چند مہربان خواتین و حضرات نے میرا مجموعہ چھپوا دیا... "غم عشق گر نہ ہوتا....." اور اس کی تقریب بھی بپا کر دی تو اشفاق احمد نے برسوں بعد اس پر لکھ کر مضمون پڑھا..... وہ شاید ان کی زندگی کا (اس حوالے سے) آخری مضمون تھا۔ ورنہ وہ ایسی تقریبات میں گفتگو ہی کرتے اور دانش و بینش کے موتی ہی بکھیرتے تھے..... دوسرے شعروں اور نظموں سے ہٹ کر انہیں اس شعر سے خاص وابستگی ہو گئی۔

جلا کے کشتیاں دریا کے ہم بھی پار گئے

ہمارے ساتھ مگر یہ ہوا کہ ہار گئے

اسلم کولسری خود بانکے شاعر ہیں اور اشفاق صاحب کے چہیتے تھے..... اشفاق صاحب نے اسے کہا..... یہ دیکھو..... اظہر کا شعر..... یار، یہ اس عہد کا بہت بڑا شعر ہے.....! اسلم کولسری نے طارق جاوید کے ذریعے مجھے یہ پیغام بھجوایا اور اس روز بانو آپا بتا رہی تھیں، بستر علالت پر پڑے وہ بیشتر اوقات یہی شعر دہراتے رہتے تھے..... یہ اشفاق احمد کی روشن ضمیری اور عالی ظرفی کی چھوٹی سی مثال ہے..... ورنہ کہاں میں اور کہاں ان کا ذوقِ شعری!!

کشف المحجوب میں حضرت علی ہجویریؒ نے لکھا ہے کہ ان کا یہ مسودہ گم ہو گیا تھا اور ایک باطل صوفی نے اسے اپنے نام سے منسوب کرنا شروع کر دیا..... پھر علی ہجویریؒ کے لفظوں میں وہ شخص حق تعالیٰ کی طرف سے ذلیل و خوار ہوا اور یہ مسودہ واپس ملا..... یہی حال اشفاق احمد کا ہے، وہ جھوٹے اور باطل لوگوں کا ہدف بن رہے ہیں، مگر یہ تہمتیں، یہ دشنام اور ایسے الزام زیادہ زندگی نہیں پاتے۔ جو اصل ہے، سچا ہے، حقیقی ہے، وہ نمایاں ہو کر ہی رہتا ہے اور اسی نے آنے والوں زمانوں تک زندہ، تابندہ اور پائندہ رہنا ہوتا ہے۔ اشفاق احمد کو ہم ابھی سمجھ نہیں سکے..... سمجھ نہیں سکتے۔ علم و دانش کے پلڑوں میں جب انہیں تولا جائے گا، جب ان کی تحریروں کا اسرار کھولا جائے گا تو ایک چکا چوند ہوگی، ایک تجلی ہو گی، ایک نورانی لہریا ہو گا..... میں اور آپ چاہے اس وقت نہ ہوں، مگر میرا ایمان ہے، ایسا ہو گا اور اشفاق احمد "سیانف" (دانائی) کی ایک علامت کے طور پر پہچانے جائیں گے۔ انشاء اللہ

اے حمید

رنگین لاچا، کرک ڈگلس۔ والٹن کیمپ اور پیر کامل

وہ مجھے پہلی بار 1948ء میں لاہور میں ملا تھا۔ ظاہر ہے پاک ٹی ہاؤس میں یا اس کے آس پاس کہیں کافی ہاؤس کے قریب ہی ملا ہوگا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو مجھے مشہور امریکی ایکٹر کرک ڈگلس یاد آ گیا تھا۔ وہی چوڑا چکلا چہرہ' مضبوط جبڑا' فراخ ماتھا' چوڑے کندھے' سرخ و سفید رنگ ... اس کے چہرے پر ایک تاثر تھا۔ کچھ اس قسم کا تاثر' جیسے وہ کوئی شرارت کرنے والا ہے یا کوئی شرارت کر کے آ رہا ہے۔ دوسری بات جو میں نے پہلی ملاقات میں نوٹ کی یہ تھی کہ وہ باتیں بہت کرتا ہے۔ دلچسپ باتیں کرتا ہے اور اس میں لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی بڑی صلاحیت ہے۔

ماضی کے دھندلکوں پر نظر ڈالتا ہوں تو کچھ جھلکیاں سی ابھرتی ہیں۔ جیسے موسلادھار بارش کے بعد بادلوں میں دور کبھی کبھی بجلی چمکتی دکھائی دیتی ہے۔ اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ جب مشرقی پنجاب سے مہاجرین کے لٹے ہوئے قافلے پاکستان میں آ رہے تھے تو وہ والٹن کیمپ میں رجسٹر پر مہاجرین کے نام وغیرہ درج کیا کرتا تھا پھر وہ ملتان چلا گیا اور وہاں مہاجرین کیمپ میں کام کرتا رہا مگر وہاں زیادہ دیر اس کا قیام نہ رہا اور وہ لاہور آ گیا۔ انہیں نمبر ایک مزنگ روڈ والا مکان الاٹ ہو چکا تھا۔ اس مکان کی تین چار منزلیں تھیں اور ایک زینہ ہر منزل سے ہوتا ہوا اوپر والی منزل تک جاتا تھا۔ اس اوپر والی منزل میں اشفاق احمد کا اپنا سٹوڈیو نما کمرہ تھا۔ ان دنوں وہ پینٹنگ بھی کرتا تھا۔

کمرے میں کتابیں، تصویروں کے فریم، رسالے ہر قسم کی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ ایک ایزل تھا جس پر ایک کینوس رکھا ہوا تھا۔ اس کینوس پر ایک آئل پینٹنگ بنی ہوئی تھی۔ یہ تجریدی آرٹ تھا جو مجھے اچھا نہیں لگا تھا۔ بعد میں یہی تصویر ممتاز مفتی کی کتاب ''اسمارائیں'' کے ٹائٹل پر نظر آئی۔ یعنی ''اسمارائیں'' کتاب کا سرورق اشفاق احمد نے بنایا تھا۔ جب اشفاق مجھے اپنی بنائی ہوئی پینٹنگ دکھا رہا تھا تو مجھے یاد ہے کمرے میں بڑا حبس اور گرمی تھی۔ مجھے یہ گرمی اور حبس آج تک یاد ہے۔

پرانی یادوں کے سٹیج کا پردہ ایک بار پھر گرتا ہے۔ بادلوں میں دھیمی دھیمی بجلی چمکتی ہے' پردہ ایک بار پھر اٹھتا ہے۔ اس بار منظر گورنمنٹ کالج لاہور نہیں نہیں پنجاب یونیورسٹی کے پائیں باغ کا ہے۔ میں چھوٹے سے پائیں باغ کی روش پر سے ہوتا ہوا اشفاق احمد کی طرف بڑھتا ہوں۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر میری طرف بڑھ رہا ہے۔ کتاب اس کے ہاتھ میں ہے۔ سنہری دھوپ نکلی ہوئی ہے۔ ہم دونوں مسکراتے ہوئے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اشفاق احمد کا سرخ و سپید چہرہ روغنی لگ رہا ہے۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ اس کے دانت چھوٹے چھوٹے مگر ہموار اور سفید تھے۔ میں نے اشفاق کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا: ''آؤ نولکھا مارکیٹ چلتے ہیں مجھے پاپ کے لیے تمبا کو خریدنا ہے۔''

اس زمانے کے اشفاق احمد کی ایک اور تصویر اس وقت میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ وہ بادامی رنگ کا گول گلے والا کرتا اور رنگین لاچا پہنے پاک ٹی ہاؤس میں دروازے کے ساتھ والے صوفے پر بیٹھا ہے۔ میں اُس کے سامنے بیٹھا ہوں۔ قیوم نظر' شہرت بخاری اور دوسرے دوست بھی موجود ہیں۔ چائے کا دور چل رہا ہے۔ بڑی گرم جوشی کے ساتھ باتیں ہو رہی ہیں۔ اس روز اشفاق لاچہ اور کرتا پہن کر پاک ٹی ہاؤس آ گیا تھا اور ماجھے کا خوبرو جٹ لگ رہا تھا۔ مجھے اس کا اس طرح کے لباس میں وہاں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ اسی زمانے میں اشفاق احمد نے اپنا مشہور افسانہ بابا۔ طویل مختصر

افسانہ ''گڈریا'' لکھا جس کی چاروں طرف دھوم مچ گئی۔ میں نے افسانہ پڑھا تو مجھے اشفاق سے اور زیادہ محبت ہوگئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب نامور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بمبئی سے لاہور واپس آ چکے تھے اور مسعود پرویز کے ساتھ مل کر ایک پنجابی فلم بنا رہے تھے۔ انہوں نے بھی اشفاق احمد کا افسانہ ''گڈریا'' پڑھ لیا تھا اور اس سے بڑے متاثر تھے۔ منٹو صاحب لکشمی مینشنز کے ایک فلیٹ میں رہتے تھے۔ ایک بار میں اور اشفاق احمد ان سے ملنے گئے تو منٹو صاحب نے اشفاق کے افسانے کی تعریف کی۔ اشفاق جھینپ گیا۔ چہرہ سرخ ہوگیا اور بولا:

''وہ منٹو صاحب بس......''

منٹو صاحب نے عقابی آنکھوں سے اشفاق کی طرف دیکھ کر کہا: ''بس کیا۔ اچھا افسانہ لکھا ہے تم نے......''

پھر منٹو صاحب نے میری طرف دیکھا اور کہا:

''تم بکواسی ہو۔ کھمبے کو دیکھ کر رومانٹک ہوجاتے ہو۔''

میں نے محسوس کر لیا تھا کہ منٹو صاحب اشفاق احمد کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ اس سے میرے دل میں رشک یا حسد کا جذبہ بالکل پیدا نہیں ہوا تھا۔

اشفاق احمد نے بانو قدسیہ سے شادی کر لی تھی اور وہ سمن آباد کے ایک مکان میں رہنے لگا تھا۔ اب وہ نمبر ایک مزنگ روڈ والے مکان سے چلا گیا تھا۔ اس کا سمن آباد والا پہلا مکان چھوٹی مارکیٹ میں سنٹرل ماڈل سکول کے سامنے تھا۔ اس مکان پر بڑے شیشے لگے تھے اور اسے شیشوں والا کوارٹر کہتے تھے۔ یہاں اشفاق نے تھوڑا عرصہ ہی قیام کیا اور دوسرے مکان میں چلا گیا۔ دوسرا مکان بھی سمن آباد میں گراؤنڈ کے سامنے تھا۔ اب یہ گراؤنڈ ایک باقاعدہ باغ میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس زمانے میں ابھی یہاں مٹی اڑتی تھی۔

میں پیدل چلتا سخت گرمی میں اشفاق احمد کے گھر پہنچ گیا۔ یہ این ٹائپ کا مکان

تھا۔ میں چھوٹی سی گلی میں سے گزر کر مکان کے عقبی صحن میں گیا۔ بانو قدسیہ باورچی خانے میں چوکی پر بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھیں۔ میں اور اشفاق احمد دیوان خانے میں آ کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں بانو قدسیہ میرے لیے آئس کریم لے آئی۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کیونکہ اس وقت مجھے آئس کریم کی سخت ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ میں سہ پہر تک اشفاق کے ساتھ رہا۔ ہم دونوں مکان کے برآمدے میں بیٹھے خدا جانے کیا باتیں کرتے رہے۔ اب وہ باتیں مجھے یاد نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے سڑک پر ٹاہلی کے درخت گرمیوں کی گرم سہ پہر میں سر جھکائے خاموش کھڑے تھے۔

اب اشفاق احمد نے ایک سائیکل خرید لی تھی۔ وہ سائیکل پر سمن آباد سے پاک ٹی ہاؤس اور ریڈیو سٹیشن آتا۔ ہم دونوں ریڈیو پاکستان لاہور کے ساتھ بطور سٹاف آرٹسٹ منسلک ہو چکے تھے۔ میرا مکان ان دنوں فلیمنگ روڈ پر تھا۔ میں لاہور ہوٹل والی سڑک پر سے ہوتا ہوا قلعہ گجر سنگھ سے نکل کر ایبٹ روڈ پر آتا تو یہاں کبھی کبھی اشفاق سے ملاقات ہو جاتی وہ سائیکل پر سوار ریڈیو سٹیشن کی طرف جا رہا ہوتا۔

پرانے ریڈیو سٹیشن کا زمانہ ہماری یاری دوستی کا بڑا خوبصورت اور ابتدائی زمانہ تھا۔ لباس کے بارے میں وہ لاپرواہ رہا ہے۔ مگر اس کی شخصیت میں بڑی کشش ہوا کرتی تھی۔ بڑا ہاتھ بھی مضبوط تھا۔ خوبصورت بھی تھا۔ اشفاق احمد کے ساتھ جو میں نے ایک طویل عرصہ گزارا ہے اس کی یادیں دھندلی نہیں پڑیں۔ ہاں کہیں کہیں سے سلسلہ ضرور ٹوٹ گیا ہے اور ایسا ہونا قدرتی بات ہے لیکن جہاں جہاں وہ مجھے یاد ہے اس یاد کی پوری جزئیات میری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ ایک طرح نیگیٹو ہیں میری یادوں کے جن کی تصویریں بنا کر میں چسپاں کرتا جا رہا ہوں۔

ہماری محفلیں زیادہ تر پاک ٹی ہاؤس میں لگتی تھیں لیکن کبھی کبھی ہم کافی ہاؤس میں بھی چلے جاتے تھے۔ میں اس لیے کافی ہاؤس جاتا کہ وہاں فضا میں رچی ہوئی کافی کی خوشبو مجھے جنوب مشرقی ایشیا کی فضاؤں میں لے جاتی تھی۔ خاص طور پر مجھے رنگون

کولمبو اور مدراس کے ریستوران یاد آ جاتے جہاں اپنی آوارہ گردی کے دوران میں بیٹھ کر میں کافی پیا کرتا تھا۔ لاہور کے کافی ہاؤس میں زیادہ تر صحافی، وکلاء اور سیاستدان ہی بیٹھتے تھے۔ شاعروں میں ریاض قادر اور ناصر کاظمی وہاں اکثر دیکھے جاتے تھے۔ مولانا چراغ حسن حسرت، ریاض قادر، سردار صادق اور بٹ کافی ہاؤس کی محفلوں میں سب سے نمایاں نظر آتے تھے۔ یہ لوگ جس میز پر بیٹھے ہوتے وہاں دوسرے لوگ بھی کرسیاں کھینچ کر آ بیٹھتے اور ان لوگوں کی سیاسی، ادبی اور دلچسپ باتیں بڑی دلچسپی سے سنتے اور ان کی لطیفہ بازیوں سے لطف اندوز ہوتے۔ میں اور اشفاق احمد دیوار کے ساتھ والی ٹیبل پر جا کر بیٹھ جاتے۔ ہاتھ ملا کر لوگوں سے علیک سلیک کرتے اور کافی پیتے ہوئے اپنی باتیں کرنے لگتے۔ سبھی ادیب اور شاعر ہمارے دوست تھے۔ ہم سب سے ملتے تھے۔ سب ہم سے ملتے تھے مگر ہم دونوں ایک دوسرے کے زیادہ قریب آ گئے تھے۔ ہماری بڑی پکی دوستی ہوگئی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے اشفاق بڑا اچھا لگتا۔ اس کی باتیں بڑی اچھی لگتیں۔ وہ پاک ٹی ہاؤس میں داخل ہوتا تو میں ہاتھ کے اشارے سے اُسے اپنے پاس بلا لیتا اور ہم خوب گھل مل کر مزے مزے کی باتیں کرتے۔ بطور افسانہ نگار وہ مشہور بھی ہوگیا ہوا تھا مگر لڑکیوں نے محبت کرنے کے معاملے میں وہ بہت پیچھے تھا۔ میں دیکھا کرتا کہ عورتوں کے ساتھ، خاص طور پر لڑکیوں کے ساتھ اس کا رویہ بڑا مشفقانہ ہوتا تھا۔ یعنی وہی ہدایتیں اور تلقین .... ! ایک لحاظ سے یہ اچھی بات بھی تھی۔ کم از کم وہ عشق کی بک بک سے بچ گیا تھا۔

اشفاق احمد نے ریڈیو پر ''تلقین شاہ'' کی سیریز شروع کر دی۔ ایک تو وہ بڑا اچھا ادیب تھا۔ دوسرے اس نے تلقین شاہ کا کردار خود ادا کیا۔ یہ سونے پر سہاگہ والی بات ہوگئی۔ پہلے براڈ کاسٹ پر ہی ''تلقین شاہ'' مشہور ہوگیا۔ اشفاق نے اپنے پنجابی لہجے میں روہتک حصار کا لہجہ شامل کر لیا تھا، جو لوگوں میں بڑا مقبول ہوگیا۔ ایک بار اشفاق نے مجھے بتایا تھا کہ لوگ اسے روہتک حصار کا لہجہ سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ ہوشیار پور کے

گردونواح کا لہجہ ہے۔ ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو مگر یہ حقیقت ہے کہ اشفاق احمد جب اس لہجے میں ریڈیو پر بولتے تو تلقین شاہ. کا کردار زندہ ہوکر ہماری آنکھوں کے سامنے آجاتا۔

زندگی کے درخت پر تصوف کا پھل عام طور پر عمر کے آخری حصے میں جا کر لگتا ہے۔ نوجوانی کے زمانے میں مجھے نہیں یاد کہ اشفاق احمد نے مجھ سے کبھی تصوف کے موضوع پر کوئی بات کی ہو۔ یہ زمانہ ہنسنے کھیلنے اور موج اڑانے کا ہوتا ہے البتہ درمیانی عمر میں آکر اشفاق نے تصوف کی باتیں شروع کر دی تھیں۔ یہ باتیں کسی ایسے سالک کی نہیں تھیں جو حقیقت کی تلاش میں نکلا ہو بلکہ ایسے پیر باصفا کی باتیں ہوتی تھیں جس نے حقائق و معارف کی منزل پالی ہو۔ نفسیاتی طور پر وہ کسی ایسے پیر کامل کی تلاش میں تھا جو اسے اپنا مرید بنانے کی بجائے پیر کامل بنا دے۔

(اُردو کا آخری داستان گو۔ مرتبہ افتخار مجاز/عرفان احمد خان)

ریاض محمود

خان صاحب جی

"ریاض بھائی آپ کا دوست چھوڑ گیا آپ کو؟"

یہ فقرہ اشفاق صاحب کے سب سے چھوٹے صاحب زادے اثیر احمد نے اس وقت مجھ سے کہا جب ہم ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں اشفاق احمد کو منوں مٹی کے نیچے دفن کر کے واپس آ رہے تھے۔ میں نے اثیر احمد کی طرف دیکھا، اس کی آنکھوں میں رکا ہوا پانی اس کے گالوں سے پھسلتا ہوا زمین میں جذب ہو گیا۔

قبرستان سے ایک سو اکیس سی ماڈل ٹاؤن کی طرف جاتے ہوئے گزشتہ چالیس پینتالیس سال کے بہت سے واقعات میری نگاہوں کے سامنے آنے لگے۔ اشفاق صاحب سے ریڈیو پاکستان کے پرانے براڈ کاسٹنگ ہاؤس میں پہلی ملاقات جو بعد میں گہرے تعلقات میں تبدیل ہو گئی۔ ریڈیو پاکستان سے مزنگ چونگی تک کا سفر جو عثمان پان والے کی دکان پر ختم ہوتا، اشفاق صاحب سمن آباد اور میں رحمان پورے کی طرف روانہ ہو جاتا۔ اس عرصے میں بے شمار موضوعات پر اشفاق صاحب سے بات کرنے، کچھ سمجھنے اور سیکھنے کا موقع ملتا۔ لاہور کی سڑکوں پر 62-1961ء میں اتنا رش نہیں ہوا کرتا تھا ہم اکثر تین بجے کے قریب ریڈیو سے نکلتے اور کوئی چھ بجے کے قریب عثمان کی دکان سے پان خرید کر اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوتے اور اس عرصے میں کونسا ایسا موضوع تھا جس پر گفتگو نہ ہوتی۔

26 نومبر 1964ء کو پاکستان ٹیلی ویژن کے تجرباتی سٹیشن نے ریڈیو پاکستان لاہور کی حدود میں اپنی نشریات کا آغاز کیا۔ اس کے پہلے جنرل منیجر آغا بشیر اور پروگرام منیجر اسلم اظہر مقرر ہوئے۔ ان کے ساتھ ذکاء درانی، نثار حسین اور فضل کمال ایسے ذہین لوگوں کی ٹیم موجود تھی لیکن ان لوگوں کی سب سے بڑی مشکل ٹیلی ویژن کے لئے سکرپٹس کا حصول تھی۔ ریڈیو کے لئے لکھنے والے موجود

تھے لیکن ٹیلی ویژن کے لئے لکھنے والے موجود نہ تھے۔ خاص طور پر ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامہ لکھنے والے بالکل ہی نہ تھے۔ اس وقت اشفاق احمد آگے بڑھے اور انہوں نے ٹیلی ویژن کے لئے ایسے سیریلز اور ڈرامے لکھے کہ لوگوں کو آج بھی وہ ڈرامے یاد ہیں۔ "تالی تھلے"، "اچے برج لاہور دے"، "کارواں سرائے"، "حیرت کدہ"، "قامہ کہانی"، "ایک محبت سو افسانے" اور "توتا کہانی" وغیرہ۔ اشفاق صاحب اپنے ڈراموں میں نئے اور انوکھے موضوعات پر قلم اٹھاتے۔ ڈرامے کے کردار بڑے جاندار، ڈرامے کی بنت نہایت باکمال اور مکالمے نہایت خوبصورت لکھتے تھے۔ ٹیلی ویژن ڈراموں میں ایکٹر کو اپنے مکالمے یاد کرنا پڑتے ہیں۔ اشفاق صاحب کے مکالموں کی خوبی یہ ہوا کرتی تھی کہ ایک مکالمے کا دوسرے مکالمے کے ساتھ ربط ہوتا تھا اور وہ ایسے خوبصورت انداز میں ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہوتے تھے کہ ایکٹر کو یاد کرنے میں کوئی مشکل پیش نہ آتی تھی۔

اشفاق صاحب ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور میں جب اپنے ڈراموں کے لئے کردار تخلیق کرتے تو ان کے ذہن میں وہ فنکار بھی ہوتا جو ان کے نزدیک اس کردار کے لئے موزوں ہوتا۔ چنانچہ جب وہ ڈرامے کا سکرپٹ پروڈیوسر کے حوالے کرتے تو اس کے ساتھ ان فنکاروں کے نام بھی ہوتے جنہیں وہ کردار ادا کرنا ہوتے۔ جب فنکاروں کو علم ہوا کہ ڈرامہ لکھنے کے ساتھ ساتھ کاسٹنگ بھی اشفاق صاحب ہی کرتے ہیں تو انہوں نے مرکزی اردو بورڈ کے چکر کاٹنے شروع کر دیئے جہاں اشفاق صاحب ڈائریکٹر جنرل تھے۔ ہر کسی کے اپنے مسائل، اپنی مجبوریاں اور اپنی ضروریات تھیں۔ ہر کسی کی خواہش ہوتی کہ اسے آنے والے ڈرامے میں ضرور کام ملے۔ اب ظاہر ہے سب فنکاروں کو کام دینا تو ممکن نہ تھا۔ دروازے اشفاق صاحب کے ہر فنکار کے لئے کھلے تھے۔ وہ کہتے یار اس دفعہ تو رہ گیا تمہارا کام اگلی دفعہ ضرور تمہارا حصہ ہوگا۔ جب وہ فنکار اشفاق صاحب سے وعدہ لے کر رخصت ہو رہا ہوتا تو اشفاق صاحب اپنے پی اے شریف الدین سے فون پر کہتے کہ شریف یہ جو صاحب آپ کے قریب سے گزر رہے ہیں ان کو روک لیے اور ایک لفافہ انہیں پیش کر دیں۔ اس لفافے میں پچاس کا ایک نوٹ ہوتا تھا جبکہ اس زمانے میں ٹیلی ویژن کے ایک ڈرامے میں کام کرنے کا معاوضہ 45 روپے ہوتا تھا۔ شریف الدین صاحب کے پاس ایسے لفافے ہر وقت موجود رہتے تھے۔

پروگرام زاویہ جس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔ اشفاق صاحب اس کا اختتام اس جملے پر کیا کرتے کہ اللہ آپ کو آسانیاں عطا فرمائے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے۔ ان کا یہ کہنا صرف کہنے کی حد تک ہی نہیں تھا بلکہ وہ اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہ کرتے۔ کوئی ایسی بات نہ کہتے جس سے ان کے مخاطب کو دکھ یا تکلیف محسوس ہو۔ اپنی گفتگو سے

دوسروں کی آزردگی ختم کرنے اور انہیں خوش کرنے کی کوشش کرتے۔ دوسروں کے دکھ سنتے، انہیں ان کی پریشانی دور کرنے کے لئے مشورے بھی دیتے لیکن اپنا دکھ کسی سے نہ کہتے بلکہ اسے اپنی ذات تک ہی محدود رکھتے۔

ایک دن میں اور میری بیگم شام کے وقت ان کے گھر ملنے گئے۔ میں نے ملتے ہی ادھر ادھر کے واقعات سنانے شروع کر دیئے۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اشفاق صاحب اور آپا قدسیہ میری کسی بات میں دلچسپی نہیں لے رہے بلکہ صرف ہوں ہاں ہی کر رہے ہیں۔ کچھ دیر تو میں زور لگا کر گفتگو کرتا رہا لیکن ادھر سے خاموشی برقرار رہی۔ میں نے کہا اچھا خان صاحب اجازت۔ کہنے لگے اچھا بھائی خدا حافظ۔ اب ایسا تو کبھی ہوا نہیں تھا کہ وہ گھر آئے کسی مہمان کو بنا تواضع جانے دیں، لیکن اس دن صورتحال مختلف تھی۔ جب ہم 121 سی ماڈل ٹاؤن سے باہر آئے تو میں نے اپنی بیگم سے کہا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خان صاحب اور آپا قدسیہ ہم سے ناراض ہیں؟

''وہ کیوں؟'' میری بیوی نے پوچھا۔

میں نے جواب میں کہا کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم سے نادانستگی میں کوئی غلطی ہو گئی ہے جس کے باعث وہ ہم سے خفا ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ہم اتنی دیر بیٹھے رہے اور انہوں نے سوائے ہوں ہاں کے کوئی بات ہی نہیں کی۔ میری بیگم کہنے لگی محسوس تو میں نے بھی کیا تھا لیکن کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے کہا کہ اب صبح ان کے پوچھوں گا کہ آخر ہم سے کیا خطا ہوئی ہے۔

اگلی صبح بیگم اخبار لئے کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''قدرت اللہ شہاب صاحب انتقال کر گئے۔'' اس نے اخبار میرے سامنے رکھتے ہوئے بتایا۔ اخبار میں شہاب صاحب کے انتقال کی خبر پوری تفصیل کے ساتھ موجود تھی۔ ''اشفاق صاحب کا شہاب صاحب سے جو تعلق تھا وہ تو میرا خیال ہے اسلام آباد پہنچ گئے ہوں گے۔'' بیگم نے پوچھا۔ ''میرا تو یہ خیال ہے کہ کل شام جب ہم ان کے ہاں گئے تو انہیں اس سانحے کی خبر مل چکی تھی اور وہ اس لئے اتنے خاموش تھے لیکن انہوں نے ہمیں کیوں نہ بتایا یہ تو ان کی واپسی پر ہی پوچھیں گے۔'' میں نے کہا۔

اشفاق صاحب اسلام آباد سے واپس آئے تو میں نے پوچھا کہ جس شام ہم آپ کے ہاں آئے تھے وکیا آپ کو شہاب صاحب کے انتقال کی خبر مل چکی تھی؟ کہنے لگے کہ ہم تو اسلام آباد کے لئے روانہ ہو رہے تھے کہ آپ لوگ آ گئے، اس لئے روانگی میں کچھ تاخیر ہو گئی۔ میں نے پوچھا آپ نے ہمیں کیوں نہ بتایا؟ کہنے لگے میں نے سوچا کہ اسے کل صبح معلوم ہو ہی جائے گا۔ اس کی رات کا ہے کو خراب کرو۔ اشفاق صاحب بچے کے آپریشن کے لئے ہسپتال میں داخل ہوئے تھے۔ جب سرجن

نے کہا تو معلوم ہوا کہ پنکر یا پرگرتھ ہے۔ بعد کے ٹیسٹوں میں معلوم ہوا کہ وہ ملیگنینٹ ہے۔اشفاق صاحب کو اس کا علم ہے کہ انہیں کیا مرض لاحق ہے۔" میں نے اشفاق صاحب کے منجھلے صاحب زادے انیس احمد خاں سے پوچھا۔ انیس کہنے لگا" میں نے بھی یہ سوال سرجن سے کیا تھا" اس کا جواب تھا کہ " گو ہم نے انہیں بتایا تو نہیں لیکن ان جیسا ذہین آدمی یقینی طور پر سب کچھ جانتا ہے۔" اشفاق صاحب نے کبھی بھی اپنے کسی دوست یا عزیز کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ صرف اس لئے کہ جب ان سے پیار کرنے والوں کو اس بات کا علم ہوگا تو وہ پریشان ہو جائیں گے۔ خود درد یں برداشت کرتے لیکن ہر ملاقاتی کو یہ ہی بتاتے کہ میں اب پہلے سے بہتر ہوں بس صرف کمزوری ہے جو آہستہ آہستہ ہی جائے گی۔ اپنے روگ کا بتا کے وہ کسی کو فکر مند، پریشان یا اس کی رات خراب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ یہ ہی ان کا مسلک تھا وہ دوسروں کو آسانیاں عطا کرتے تھے اور دوسروں کی پریشانیاں اپنی جھولی میں ڈال لیا کرتے تھے۔

جب بھی کسی کی مدد کرتے تو مدد لینے والے کو یہ احساس نہ ہونے دیتے کہ وہ اس پر کوئی احسان کر رہے ہیں بلکہ ایسا تاثر دیتے گویا اس نے وہ مدد قبول کر کے اشفاق صاحب پر احسان کیا ہے۔ کسی عزیز، رشتے دار یا دوست کو پریشانی میں دیکھتے تو ایسا ظاہر کرتے کہ اس کی مشکل کا ان پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا لیکن اس کے علم میں لائے بغیر عملی طور پر اس کی مشکل کو حل کرنے کے لئے کوششیں شروع کر دیتے۔ اگر مسئلہ حل ہو جاتا تو متاثرہ شخص کے سامنے اس طرح بات کرتے گویا انہوں نے کچھ کیا ہی نہیں۔ وہ تو اتفاق سے مجھے تمہارے سیکرٹری کا فون آگیا۔ پوچھنے لگا کوئی خدمت بتائیں۔ مجھے تمہارا خیال آگیا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہمارا برخوردار ٹرانسفر کی وجہ سے پریشان ہے اس کی مدد فرمائیں۔ اب یہ اس کی شرافت ہے کہ اس نے ذرا سے اشارے پر تمہارا کام کر دیا۔ یہ جدا بات ہے کہ ان سیکرٹری صاحب کو ملنے اور ان تک اصل بات پہنچانے کے لئے اشفاق صاحب نے کتنا وقت صرف کیا اور اسے کیسے قائل کیا۔

اشفاق صاحب ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ، جدید علوم سے واقفیت رکھنے والے اور مغربی افکار اور فلسفے سے متاثر ایک ماڈرن انسان تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے ورثے، تاریخ اور اسلام سے بھی وہ مکمل طور پر وابستہ تھے۔ اس ضمن میں کچھ جاننے اور کچھ حاصل کرنے کی تڑپ ہمیشہ ان میں موجود تھی۔ اتفاق سے ان کی ملاقات نور والوں کے ڈیرے کے باباجی سے ہو گئی۔ باباجی کے افکار، گفتگو اور فلسفے نے اشفاق صاحب کو بے حد متاثر کیا۔ ایک دن مجھے کہنے لگے کہ میں نے مغرب کے علوم پڑھ کر محض وقت ہی ضائع کیا۔ اصل علم اور دانش تو ان بابوں کے پاس ہے۔ اشفاق صاحب اپنی زندگی

میں بہت سے بابوں سے ملے۔ ان بابوں کے فلسفے، خیالات اور افکار کا اثر ان کی تحریروں پر بھی پڑا اور ان ہی بابوں کی بدولت انہوں نے من چلے کا سودا جیسا کامیاب سیریل تحریر کیا۔

پاکستان سے ان کو بے پناہ محبت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ پاک دیش ترقی کرے، مادی طور پر بھی اور روحانی طور پر بھی۔ پاکستان کے بارے میں کوئی ناخوشگوار خبر ملتی تو آزردہ ہو جاتے۔ ہم لوگ پوچھتے کہ حالات بہتری کی طرف کیوں نہیں جا رہے تو ان کا جواب ہوتا کہ اسی خرابی میں سے بہتری کی صورت نکلے گی۔ اسی طرح وہ معاشرتی انحطاط سے بھی سخت پریشان رہتے۔ اپنی تحریروں، ڈراموں اور تقریروں میں معاشرہ کی اصلاح کو خاص طور پر مد نظر رکھتے۔ تلقین شاہ کا کردار ہمارے معاشرے کا ایک ایسا کردار ہے جو کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔ "تلقین شاہ" اپنے مہمانوں کے سامنے تو کہتا ہے کہ ہمسایوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں، ہمسائے ماں پیو جائے لیکن جب مہمان رخصت ہو جاتے تو تلقین شاہ اپنے ملازم ہدایت اللہ کو کہتا ہے کہ ذرا پانی تو کھول دے نل کا۔ ہدایت اللہ کہتا ہے کہ حضور اگر ہم نے پانی کھول دیا تو اوپر رہنے والے ہاشمیوں کو پانی نہیں پہنچے گا۔ تلقین شاہ کہتا ہے یہ ہی تو میں چاہتا ہوں۔ ہدایت حیرانی سے کہتا ہے کہ ابھی تو آپ فرما رہے تھے میرے آقا کہ ہمسایوں کے بڑے حقوق ہوتے ہیں لیکن اب آپ کیا فرما رہے ہیں۔ تلقین شاہ کہتا ہے کہ یہ ضروری تو نہیں کہ انسان جو کچھ کہے اس پر عمل بھی کرے۔ تو دو کوڑی دا ملازم ایں تینوں جید اں آکھیا جائے اوداں کریا کر خواہ مخواہ تنقیاں نہ نکالن بیٹھ جایا کر جا، جا کے کھول دے نلکا۔

ہپوکریسی وہ مرض ہے جس کا شکار ہمارے معاشرے کے اکثر افراد ہیں۔ اشفاق صاحب نے تلقین شاہ کے ذریعے اس مرض کے سدباب کے لئے بھرپور جہاد کیا۔

خوش خوراک بہت تھے۔ دوسروں کو کھلا کے بھی بے انتہا خوشی محسوس کرتے۔ گھر میں اگر پانچ مہمان آئے ہیں یا دس، یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کھانے کا وقت ہو اور مہمان بنا کھانا کھائے چلے جائیں۔ آپا قدسیہ لکھنا پڑھنا چھوڑ کے ہانڈی روٹی میں مصروف ہو جاتیں۔

جس طرح وہ اپنی تحریروں اور ڈراموں میں تجربات کرتے تھے اسی طرح کھانوں کے تجربات بھی ہوتے۔ قدسیہ اگر مٹن کو فلاں طریقے سے پکایا جائے تو کیسا رہے گا؟ آپا قدسیہ کہتیں خان صاحب میں آج ہی پکا کے دیکھتی ہوں اور پھر خان کی تپی پر ستار اس ڈش کو اپنی محنت سے ایسا بنا دیتی کہ مہمان انگلیاں چاٹتے رہ جاتے۔ اشفاق صاحب کے ساتھ میری دوستی کا ایک سبب ہم دونوں کا خوش خوراک ہونا بھی تھا۔ کبھی توے کی مچھلی کھانے کے لئے قصور جا رہے ہیں تو کبھی موچی دروازے میں سائیں یا لاہور کے صدر بازار میں ماجھے کی دکان کے چکر کاٹنے جا رہے ہیں۔ تکے کباب انہیں بہت پسند تھے۔

احباب کو گھر پہ مدعو کرتے اور اپنے ہاتھ سے سیخ کباب بنا کے کھلاتے۔ بیماری کے دنوں میں ایک دن کہنے لگے ریاض محمود کتنے افسوس کی بات ہے کہ لاہور جیسا شہر اور اس میں ایک بھی اچھا کبابیا نہیں رہا۔ میں نے عرض کی کہ کسی روز گھر پہ سیخ کباب لگا لیتے ہیں۔ کہنے لگے کچھ دن ٹھہر جاؤ موسم بدل جائے اور میں کچھ بہتر ہو جاؤں تو پھر کسی روز گھر پہ سیخ کباب ضرور لگائیں گے...... لیکن بدقسمتی سے وہ موسم بدلنے سے پہلے ہی ہم سے جدا ہو گئے۔ عزیزوں، رشتے داروں اور دوستوں کے درمیان کھانا پکانے کے مقابلے کرواتے اور اول نمبر پہ آنے والے کو ایک کرنسی نوٹ پر دستخط کر کے انعام دیتے۔ ایک بار قلفے کا ساگ گوشت پکا کر میں یہ انعام حاصل کر چکا ہوں۔

خوش گفتار ایسے تھے کہ جس محفل میں موجود ہوتے وہاں ہر کوئی بس اشفاق صاحب کی سنتا کسی اور کا دیا نہ جل پاتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ اشفاق صاحب ریڈیو سٹیشن تشریف لائے اس خاکسار کے کمرے میں گپ شپ شروع ہو گئی۔ کچھ ہی دیر کے بعد کمرہ ان کے مداحوں سے بھر جاتا۔ جس کسی کو بھی معلوم ہوتا کہ اشفاق صاحب فلاں جگہ بیٹھے ہیں وہ کھنچا چلا آتا۔ ان میں سٹیشن ڈائریکٹر سے لے کر نائب قاصد تک سبھی شامل ہوتے۔ گفتگو کا ایسا انداز، سلیقہ اور قرینہ جو اشفاق صاحب کو حاصل تھا کم کم لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ ریڈیو سے میری وابستگی گزشتہ اڑتیس سال سے ہے لیکن میں نے ان جیسا خوش گفتار کسی اور کو نہیں پایا۔

اشفاق صاحب اپنی تحریروں، ریڈیائی اور ٹیلی ویژن ڈراموں میں اکثر تجربات کیا کرتے تھے۔ ریڈیو کے لئے انہوں نے ایک ڈرامہ دس دسمبر کے نام سے لکھا جسے خود انہوں نے ہی پروڈیوس کیا۔ یہ سارا ڈرامہ آؤٹ ڈور یعنی سٹوڈیو سے باہر ریکارڈ ہوا اور اس نے ہماری نظریاتی تاریخ کا ایک نیا باب تحریر کیا۔ دس دسمبر سے پہلے اور بعد میں آج تک کسی نے مکمل طور پر آؤٹ ڈور میں ریڈیو ڈرامہ ریکارڈ نہیں کیا۔

دھوپ اور سائے کے نام سے ایک تجرباتی فلم بھی بنائی جو موضوع کے اعتبار سے ایک اعلیٰ معیار کی فلم تھی لیکن تکنیکی خامیوں کے باعث باکس آفس پہ ہٹ نہ ہو سکی۔ اشفاق صاحب کے گھر مہمانوں کا آنا جانا تو رہتا ہی تھا لیکن ٹیلی فون نے تو بالکل ہی پریشان کر دیا۔ صبح سے ٹیلی فون کی گھنٹی بجنی شروع ہوتی اور رات گئے تک جاری رہتی۔ لوگ ملاقات کا وقت مانگتے۔ اپنے مسائل کا حل دریافت کرتے، کچھ ملکی حالات کے بارے میں ان کی رائے جاننا چاہتے۔ یا پھر کسی تقریب کی صدارت کے لئے تقاضا کیا جاتا۔ ٹیلی فونوں کی بہتات اشفاق صاحب کو تھکا دیتی۔ اکثر کہتے کہ ایک تو یہ ٹیلی فون کوئی کام نہیں کرنے دیتا۔ نہ پڑھنے کا وقت ملتا ہے نہ سوچنے کا اور نہ ہی لکھنے کا۔ ایک روز

جب پندرہ بیس ٹیلی فون آگے پیچھے آگئے تو میں نے عرض کیا کہ آپ ایک Telephone Attendent رکھ لیں جو لوگوں سے یہ کہے کہ صاحب مصروف ہیں یا گھر پر نہیں ہیں۔ کہنے لگے "ریاض خلق خدا بہت دکھی اور پریشان ہے بڑی بڑی دور سے لوگوں کے فون آتے ہیں۔ لوگ اپنی پریشانیوں اور مشکلوں کا حل چاہتے ہیں۔ اب میں ان پریشان حال اور غمزدہ انسانوں سے بات نہ کر کے انہیں مزید پریشان نہیں کر سکتا۔

صبح کے وقت میں اور اشفاق صاحب ڈی بلاک ماڈل ٹاؤن کی فٹ بال گراؤنڈ میں سیر کیا کرتے۔ اشفاق صاحب اسے اپنی محبوب گراؤنڈ کہا کرتے۔ میں کہا کرتا کہ یہ گراؤنڈ پوری طرح ہموار نہیں ہے ساتھ ہی پختہ سڑک ہے صبح کے وقت کوئی رش بھی نہیں ہوتا اس لئے سڑک پر چہل قدمی بہتر رہے گی۔ اشفاق صاحب کہنے لگے سڑک پر Pollution ہوتی ہے گراؤنڈ میں کم از کم خالص ہوا تو ملتی ہے۔ اب یہ اتفاق ہے یا کوئی اور وجہ کہ اشفاق صاحب کی نماز جنازہ، قل اور چہلم بھی ان کی اسی محبوب گراؤنڈ میں ہوئے۔

سیر کے دوران مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی اور ان کی رائے جاننے کا موقع ملتا۔ ایک دن ملکی حالات پہ گفتگو ہو رہی تھی۔ بتانے لگے کہ صدر پاکستان پرویز مشرف صاحب نے ایک میٹنگ میں بلوایا۔ دوران گفتگو صدر صاحب نے پوچھا کہ اشفاق صاحب ملک کی بہتری کے لئے کوئی تجویز دیں۔ اشفاق صاحب کہنے لگے کہ میں نے کہا" صدر صاحب۔ خلق خدا بہت دکھی ہے۔ اسے ایک کندھے کی ضرورت ہے جس پر سر رکھ کے وہ اپنا دکھ بیان کر سکے اور دو آنسو بہا سکے۔ پہلے یہ کام ہمارے بابے کیا کرتے تھے جو لوگوں کے دکھ سن کے انہیں دلاسہ دیتے اور ان کا حوصلہ بڑھایا کرتے لیکن اب بابے نہیں رہے اور نہ ہی وہ کندھے۔ لوگ اور کچھ نہیں مانگتے صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ان کے دکھ سننے والا کوئی تو ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ اشفاق صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ آخری بابا اور کندھا بھی ہم سے چھن گیا ہے جو لوگوں کے دکھ سنا کرتا تھا، انہیں تسلی دیا کرتا تھا، انہیں مشکلات سے نکلنے کا راستہ سمجھایا کرتا تھا، انہیں اپنے بابوں کی باتیں سنایا کرتا تھا۔

اشفاق احمد کے جانے کے بعد خلق خدا پریشان ہے کہ اب بابوں کا علم کون ان تک پہنچائے گا؟ کون علم و دانش کی باتیں انہیں سنائے گا؟ کون ان کے دکھ سنے گا اور کون ان کے زخموں پر مرہم رکھے گا؟

سرفراز حسین

گور پیا کوئی ہور

عجیب سے لوگ!

اشفاق صاحب کے پتے کا آپریشن ہوا۔ اچھا بڑا آپریشن تھا۔ اشفاق صاحب نے ہوش میں آنے پر ایک بار پھر اف یا ہائے نہیں کیا۔

بانو آپا کے اکلوتے بھائی کا اچانک دل کا دورہ پڑنے سے انتقال ہو گیا۔ آپا نے کوئی آہ و بکا نہیں کی۔ خبر سنی اور چپ بیٹھی رہ گئیں۔

قدرت اللہ شہاب کے انتقال کی خبر آئی، بانو خاموش ہو گئیں۔ کچھ نہیں بولیں۔

اور پھر اشفاق صاحب نے آخری سانس لیا تو بانو آپا ایسی چپ ہوئیں کہ ان کی خاموشی مسئلہ بن گئی۔ اخبارات میں نمایاں چھپا کہ بانو آپا چپ ہو گئی ہیں، مسلسل چپ ہیں۔ سب کچھ سنتی ہیں، دیکھتی ہیں مگر کوئی بات نہیں کرتیں۔ کسی بات کا جواب نہیں دیتیں!

عجیب سے لوگ! دوسروں کے دکھ درد کے بارے میں لاکھوں الفاظ لکھنے / بولنے والے اپنے دکھ کی بات آئی تو چپ ہو گئے۔

اشفاق احمد کی زندگی، شخصیت، ان کا فن، ان کی داستان گوئی، افسانہ نویسی، ان کی شاعری، تحریریں، اردو سائنس بورڈ، ریڈیو ٹیلی ویژن پر بات چیت، ڈرامے ... تلقین شاہ، سفرنامے اور علمی، ادبی مجلسوں میں شگفتہ بیانی ... بہت سے زاویے، بہت سے پہلو، ان پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ ہر ادیب و شاعر ہر چھوٹے بڑے کالم نگار نے ان کے بارے میں کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ کوئی بات باقی نہیں رہی۔ بہت سے انکشافات ہوئے۔ ان کی اردو پنجابی شاعری سامنے آئی، بعض لوگوں کو پہلی بار معلوم ہوا کہ اشفاق احمد اورینٹل کالج لاہور میں قائم ہونے والے پنجابی کے شعبہ کے پہلے استاد

تھے۔ یہاں دو سال تک باقاعدہ پڑھاتے رہے۔ وہ دیال سنگھ کالج میں بھی دو سال استاد رہے۔ بہت سے لوگوں نے ان کے ساتھ ذاتی روابط اور ملاقاتوں کی باتیں بتائی ہیں ان سے بھی بہت سے نئے پہلو سامنے آئے ہیں۔

میری اشفاق صاحب کے ساتھ نیاز مندی اور پہلی ملاقات کے درمیان تقریباً 22،20 برس کا فاصلہ حائل رہا۔ اشفاق صاحب اور میں دونوں لاہور میں ہی رہے مگر کبھی ملاقات نہ ہو سکی۔ اس کی وجہ بڑی عجیب سی تھی کہ میں خود اشفاق صاحب سے ملنے سے گریز کرتا رہا۔ وجہ بڑی عجیب تھی جو میں ابھی بیان کرنے والا ہوں۔ تقریباً 24 برس پہلے پنجاب آرٹس کونسل کی ایک تقریب میں اشفاق صاحب بطور صدر آئے ہوئے تھے۔ میرا ان سے آمنا سامنا ہوا تو میں نے کہا کہ جناب میں آپ سے ملنے سے گریز کرتا رہا ہوں مگر آج انہونی ہو گئی ہے اور آپ سے ملاقات ہو گئی ہے۔

میری بات پر وہ چونکے! حیرت زدگی کے عالم میں کہنے لگے کہ "بھائی تم نے عجیب بات کہی ہے؟ کیا وجہ ہے؟ مجھ سے کسی بات پر ناراض ہو؟" میں نے کہا کہ نہیں جناب ناراض کیسے ہو سکتا ہوں۔ آپ تو میرے لئے بہت محترم، بہت ادب والی شخصیت ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں نے تقریباً 22،20 برس پہلے آپ کی افسانوں کی کتاب "ایک محبت سو افسانے" پڑھی تھی۔ اس کے افسانے بہت خوبصورت تھے، بہت سحر انگیز رومانی داستانیں، ہر افسانے کا اپنا تاثر، اپنی خوبصورتی۔ مجھے ان افسانوں کی بہت سی سطریں زبانی یاد ہیں، مثلاً اس ہندو لڑکی کی باتیں جو پاکستانی فوج کے ایک کپتان کو کہتی ہے کہ تمہارے پاکستان چلے جانے کے بعد میں نے ایم اے اردو کیا اور شاعری شروع کر دی۔ میں اس وقت ہندوستان کی مشہور ترین شاعرہ ہوں، بہت سے اعزازات و انعامات ملے ہیں، بہت سے شعری مجموعے چھپے ہیں ان کے غیر ملکی زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں مگر..... مگر یہ کہ میں چھوٹی بحر کا ایک شعر کہنا چاہتی ہوں جو آج تک نہیں کہہ سکی!"

میں نے اشفاق صاحب کو ایک دو دوسرے افسانوں کے جملے بھی سنائے۔ اشفاق صاحب بہت حیران ہوئے کہ بھائی تمہیں میرے جملے زبانی یاد ہیں مگر عجیب معاملہ ہے کہ تم مجھے ملنے سے گریز کرتے رہے؟ اس کی کیا وجہ تھی؟ تم نے تو مجھے ڈرا دیا ہے!

"وجہ یہ" میں نے کہا "کہ ان افسانوں کو پڑھنے کے بعد میرے ذہن میں افسانہ نگار کی شخصیت کا بہت خوبصورت نقش قائم ہو گیا ایک سحر انگیز شخصیت جو اس طرح کے خوبصورت جملے، خوبصورت مکالمے لکھتی ہے وہ اسی طرح کی خوبصورت باتیں بھی کرتی ہو گی، ایک اجلی اجلی سی شخصیت جس کی باتوں سے علم و ادب کی چاشنی منعکس ہوتی ہو! میرے ذہن میں آپ کے بارے

میں ایسا خاکہ قائم ہو گیا تو میں نے فیصلہ کیا کہ آپ سے ملنا چاہئے مگر ایک واقعہ ایسا ہوا کہ میں نے یہ فیصلہ ترک کر دیا۔ ہوا یوں کہ اسی بڑے دور کے بہت خوبصورت رومانی افسانے لکھنے والی ایک شخصیت سے کچھ اخباری نوعیت کا کام پڑ گیا۔ ان صاحب سے ملنے ان کے گھر گیا تو انہوں نے کہا کہ وہ اس طرح ملنا پسند نہیں کرتے۔ وہ کسی اچھے ہوٹل میں کافی کی پیالی سامنے رکھ کر میرے سوال کا جواب دے سکتے ہیں۔ مجھے ان صاحب کو اگلے روز اپنے خرچے پر ایک ہوٹل میں بلانا پڑا۔ انہوں نے کافی پی اور بڑے تکبر کے ساتھ میرے سوال کا جواب لکھوایا۔ میں نے اشفاق صاحب سے کہا کہ اس واقعہ کے بعد میں محتاط ہو گیا اور آپ سے ملنے کا فیصلہ ترک کر دیا کہ کہیں آپ نے بھی اسی طرح کا رویہ اختیار کیا تو میرے ذہن میں اشفاق احمد کی ذات اور شخصیت کے بارے میں بنا ہوا خوبصورت بت پاش پاش ہو جائے گا۔ میرے لئے یہ بات بہت اذیت ناک ہوتی اس لئے میں نے آپ سے ملنے سے گریز کیا۔

میری بات سن کر اشفاق صاحب متفکر دکھائی دیئے۔ مجھے کہنے لگے کہ تمہارے پاس سواری نہ ہو تو میں تمہیں تمہارے دفتر چھوڑ دوں؟ میرا دفتر قریب ہی تھا مگر یہ کہ اشفاق صاحب مجھے چھوڑنے جا رہے تھے اور میں نے ہاں کر دی۔ انہوں نے مجھے مشرق اخبار کے گیٹ کے سامنے اتارا۔ میں چلنے لگا تو آواز دے کر بلایا، کہنے لگے کہ یار سرفراز! تم نے آج مجھے پریشان کر دیا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کہ تمہارے ذہن پر میرے بارے میں قائم نقش خراب تو نہیں ہوا؟

"نہیں. نہیں" میں نے کہا "وہ نقش پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا ہے۔" اشفاق صاحب نے اطمینان کی گہری سانس لی اور چلے گئے۔

اس کے بعد کا ایک طویل دور ہے۔ اشفاق صاحب کی تحریریں پڑھتے، ریڈیو ٹیلی ویژن پر ان کے تحریر کردہ ڈرامے دیکھتے اور ان کی باتیں سنتے ایک عرصہ گزر گیا۔ پھر ان سے ملاقات ہوئی اور ملاقاتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ وہ جس تقریب میں بھی آتے میں وہاں پہنچنے کی کوشش کرتا۔ ایک بار ایک تقریب میں کچھ لوگوں کے سامنے کہا کہ میں سرفراز سے ڈرتا ہوں اس نے مجھے بڑی آزمائش میں ڈال رکھا ہے۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگے کہ وہ نقش قائم ہے نا!

اشفاق صاحب کے ساتھ بہت سی ملاقاتیں! ان کے گھر پر، باہر، تقریبات میں، بیرون شہر . یا ان کے ساتھ بہت سی نشستوں میں موجود ہونے کا موقع ملا، ان کی باتیں گھنٹوں سنتے جاؤ، ساغر ہاشمی کی ادبی تنظیم بزم ہم نفساں کے اجلاسوں میں ان سے نئے افسانے سنے۔ یہ افسانے ابتدائی دور کی خوبصورت رومانیت سے مختلف کیفیات اور سامنے دکھائی دینے والے زمینی حقائق کو بیان کرتے

تھے۔ سچی تحریری، خوبصورت عکاسی کرتے تھے۔ ان کا ایک طویل افسانہ آخری بار کینال ویو ہاؤسنگ سوسائٹی میں سعید شیخ صاحب کی قیام گاہ پر سنا۔ افسانہ اٹلی کے ماحول سے شروع ہوا اور مختلف ڈرامائی کیفیات کے بعد لاہور میں داتا گنج بخشؒ کے دربار پہ آکر ختم ہو گیا۔ یہ ایک بہت بڑا تاثراتی افسانہ تھا اس پر ایک بڑی فلم بن سکتی تھی۔

مگر اشفاق صاحب کو تو اور بھی بہت سے کام تھے جو ایک ہی وقت میں کرنے ہوتے تھے۔ افسانے، ڈرامے لکھنے ہوتے تھے۔ 'داستان گو'' چھاپنا ہوتا تھا۔ اردو سائنس بورڈ کو چلانا ہوتا تھا۔ ریڈیو پر تلقین شاہ کا پروگرام پیش کرنا ہوتا تھا۔ ٹیلی ویژن کے لئے ڈرامے تیار کرنا ہوتے تھے اور پھر شہر کے اندر اور باہر مسلسل تقریبات کی صدارت بھی کرنا ہوتی تھی اور یہ کہ وہ یہ سب کچھ بڑی آسانی کے ساتھ کر لیتے تھے۔ وہ ہر تقریب میں کوئی نئی داستان سناتے۔

اس بات پر سب متفق ہیں کہ اشفاق صاحب صرف افسانے لکھتے رہتے تو بھی بہت مشہور و مقبول ہوتے مگر انہوں نے افسانہ نگاری کو عین عروج پہ لا کر چھوڑ دیا اور الیکٹرانک میڈیا کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس میں تلقین شاہ اور ڈرامہ نگاری کے ذریعے کمال فن کا مظاہرہ کیا۔ وہ کسی ایک خانہ میں بند ہو کر نہ رہ سکے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کی عالمگیر شہرت اور مقبولیت کے لئے ان کا صرف ریڈیو کا فیچر تلقین شاہ ہی کافی تھا۔ اشفاق صاحب کے انتقال پر میں نے خبریں اخبار میں ایک ریفرنس منعقد کرایا۔ اس میں بہت سے سینئر ادیب و شاعر و دانشور موجود تھے۔ انتظار حسین نے ریفرنس کی صدارت کی۔ ایک بات پر سب کا اتفاق تھا کہ اس عہد کا سب سے بڑا داستان گو چلا گیا جس کی باتیں دلوں میں اثر کرتی تھیں۔

اشفاق صاحب کے ساتھ آخری ملاقات بہت مختلف اور درد انگیز ماحول میں ہوئی۔ مجھے پتہ چلا کہ اشفاق صاحب شدید علیل ہیں اور مقامی ہسپتال میں ان کا آپریشن ہوا ہے۔ میں، ڈاکٹر اختر شمار، حسین شاد اور عباس نجمی پھول لے کر ان کی عیادت کے لئے ہسپتال گئے۔ ان سے ملاقات ممنوع تھی مگر ہم لاعلمی میں ان تک پہنچ گئے۔ ان کا جسم پٹیوں میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ جیتے ہوئے تھے مگر بول نہیں رہے تھے۔ ہم لوگ زیادہ دیر وہاں نہیں ٹھہرے۔ باہر آ کر ڈاکٹر سے ان کی حالت کے بارے میں پوچھا، ڈاکٹر نے اس طرح کا گول مول جواب دیا کہ وسوسے شروع ہو گئے۔ میں نے حسین شاد سے کہا کہ معاملہ کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ وہ بھی متفکر دکھائی دے رہے تھے۔ ہم افسردگی کے عالم میں ہسپتال سے باہر آئے اور پھر اشفاق صاحب کا وہ سفر شروع ہو گیا جس کی انتہا سے کبھی کوئی لوٹ کر نہیں آیا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ اشفاق صاحب کی شخصیت، ذات اور فن کے ہر پہلو پر ہر زاویے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ شاید ہی کوئی پہلو رہ گیا ہو جس پر بات نہ کی گئی۔ ان کی اور بانو آپا کی مثالی جوڑی کے بارے میں بہت سی باتیں چھپ چکی ہیں۔ ان ساری باتوں میں مستنصر تارڑ کا ایک جملہ بہت نمایاں دکھائی دے رہا ہے کہ اشفاق صاحب نے ہمیں اتنا کچھ دے دیا ہے کہ جو ان کے چلے جانے کے بعد بھی ہم سب کو مصروف اور زیر اثر رکھے گا۔

ہمیں احساس ہی نہیں ہونے دے گا کہ وہ چلے گئے ہیں۔ ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں اور یہ بات درست بھی ہے۔ جس طرح مرزا غالب، فیض احمد فیض اور علامہ اقبال جیسی شخصیات اپنے کلام، اپنے بیان اور اپنے حرف و لفظ کی بناء پر ہر وقت زندہ و تابندہ اور اپنے درمیان دکھائی دیتی ہیں اسی طرح اشفاق احمد جیسی ہمہ گیر شخصیت بھی کبھی گم نہیں ہو سکتی۔ وہ اس طرح موجود اور دکھائی دیتے ہیں۔

''بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں، گور پیا کوئی ہور!''

(ماہنامہ ادبِ لطیف، لاہور، مئی ۲۰۰۵ء)

> **بابوں کی میں نے اپنے طور پر تعریف بھی آپ کی خدمت میں پیش کی تھی، اور اس کی DEFINATION بھی بتائی تھی کہ ضروری نہیں کہ وہ بابا ایک لمبا سا چوغہ پہنے ہوئے گلے میں ایک ہار ڈالا ہو۔ یہ ضروری نہیں۔ ایک بابا میں نے بتایا تھا کہ بہت ماڈرن، اعلیٰ درجے کا تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے سرخ رنگ کی چوڑی پھن دار ٹائی لگائے ہوئے۔ اس کے اندر گولڈ کا بروچ ٹانکے ہوئے۔ اعلیٰ درجے کا کیمرا ہاتھ میں اُٹھائے ہوئے، اور جتنی بھی اس موجودہ دور کی ساری EQUIPMENTS ہیں، وہ اپنے ساتھ لیے ہوئے ہے، وہ بھی بابا ہوسکتا ہے۔**
>
> **اشفاق احمد...... ''زاویہ'' سے اقتباس**

سلیم اختر

داستان سرائے کا داستان گو!

7 ستمبر کو بے حد گرم اور شدید حبس والی سہ پہر کو ماڈل ٹاؤن ڈی بلاک کی بھاپ چھوڑتی گھاس پر اہل لاہور کا اژدھام..... ادیب، شاعر، صحافی، میڈیا سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات کے ساتھ نوجوانوں اور طلبہ کی بھی کثیر تعداد۔ ہم سب اس ہستی کو آخری سفر پر محبت، عقیدت اور احترام کے جذبات کے ساتھ الوداع کہنے آئے تھے جو یوں تو اشفاق احمد نام رکھتا تھا مگر دنیا اسے دانشور، صوفی، درویش، تلقین شاہ، خان صاحب اور بابا جی کے نام سے جانتی اور مانتی تھی۔ جنازہ دیکھا تو میں نے تاسف سے سوچا کہ موت نے کیسے خوش گفتار شخص کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش کر دیا۔

اشفاق احمد ان ادیبوں میں سے تھے جو خوش اسلوب نثر کے ساتھ خوش آہنگ لہجہ میں گفتگو اور تقریر بھی کر سکتے تھے۔ جن اصحاب نے ان سے گفتگو نہ کی یا ان کی تقریر نہ سنی وہ اشفاق احمد کی خوش بیانی اور خوش الحانی کا اندازہ ہی نہیں لگا سکتے۔

اشفاق احمد بنیادی طور پر مصلح تھے اسی لئے وہ پاکستانیوں کو عمل خیر کی تلقین کرتے رہتے تھے ان پاکستانیوں کو جن کے لئے عمل شر ہی عمل خیر ثابت ہوا کرتا ہے اشفاق احمد بنیادی طور پر بے حد مذہبی تھے مگر مذہب کو انہوں نے صوفیا کی تعلیمات کے توسط سے حاصل کیا اسی لئے ملا کی پسندیدگی کے باوجود وہ خود نہ تو ملا بنے اور نہ ہی ملائیت پر مبنی بنیاد پرستی کو شعار زیست بنایا۔

اشفاق احمد کی شخصیت، خیالات، تصورات میں بظاہر تنوع نظر آتا، ایسا تنوع جس نے ڈراموں اور افسانوں کی صورت میں تخلیقی سطح پر اظہار پایا لیکن اس تمام تنوع کی فکری اساس تصور واحد پر استوار تھی۔ عمل صالح، عمل خیر۔ وہ معلم اخلاق تھے اور اسی لئے تلقین شاہ!

مگر تلقین کے لئے تلقین شاہ نے چوب خشک ملا کا خشونت اسلوب نہ اپنایا بلکہ اس مقصد کے لئے

انہوں نے لوک دانش کا سہارا لیا۔ اس لوک دانش کے مظہر ان کے معروف بابے تھے اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اشفاق صاحب صاحب حال بزرگوں کی تلاش میں رہتے تھے اگر کسی پہنچے ہوئے شخص کے بارے میں علم ہوتا تو دور افتادہ علاقوں اور پسماندہ گاؤں تک اس سے ملنے کے لئے جانے میں کوتاہی نہ کرتے۔ مجھ سے ایک مرتبہ کہا

"سلیم! تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے جہاں زیب بلاک میں ایک زبردست شخص رہتا ہے۔"

میں نے نفی میں جواب دیا تو وہ بڑی دیر تک اس کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔

یاروں کی محفل میں بعض اوقات اس پر بحث ہوتی کہ کیا واقعی بابوں کا وجود ہے؟ بعض اسے تسلیم نہ کرتے۔ لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں سے قطرہ قطرہ جو علم حاصل کیا اس نے ان کی شخصیت میں رنگ آمیزی یوں کی کہ وہ خود ہی لوک دانش کی علامت بن گئے۔ یعنی بابا!

اشفاق احمد ہم پروفیسروں کو تاڑتے کہ تم لوگ علم کے بجائے ڈگریوں کے پیچھے دوڑتے ہو۔ وہ مروج تعلیم اور تعلیمی نصاب اور نظام کے سخت خلاف تھے کہ ان کے بموجب پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان تعلیم یافتہ افراد نے پہنچایا ہے۔ اس ضمن میں ان کی یہ دلیل تھی کہ سب سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ اسلام آباد میں آباد ہیں اور یہی لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر پاکستان کے مسائل اور عوارض کا باعث ہیں "پڑھا لکھا" ہونے کے وجہ سے میں ان کی یہ بات درست تسلیم نہ کرتا مگر میں ان سے بحث نہ کر سکتا کہ گفتار کے اس غازی کو بحث میں دلائل و براہین سے قائل کرنا ناممکن تھا۔

اشفاق احمد بھی ہماری طرح ایم اے اردو تھے۔ دو برس تک دیال سنگھ کالج میں اردو کے لیکچرار بھی رہے مگر پھر انہیں اٹلی جانے کا موقع مل گیا جہاں اردو کی تدریس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جدید فلم سازی کی تکنیک سے واقفیت پیدا کی۔ گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی میں فلم میں واقعیت نگاری کی روش کے سلسلہ میں اٹلی سرفہرست تھا اور نیو ویو فلموں کا گرو وتارو ڈی سکا تھا جس کی "بائیسکل تھیف" اب کلاسک میں شمار ہوتی ہے اشفاق صاحب نے اس سے فلم سازی کے گر سیکھے۔ ان ہی ایام میں ماضی کی مشہور ایکٹرس انگرڈ برگمین اور اس کے فلمساز شوہر سے بھی ان کے روابط رہے یہاں جب اشفاق احمد واپس آئے تو وہ فلمسازی کے جدید تصورات سے آگاہ اور جدید تکنیک کے رمز شناس تھے اور اسی انداز پر انہوں نے خود بھی ایک فلم پروڈیوس کی لیکن یہ فلم کمرشل کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

فلم کے بعد اشفاق صاحب اور بانو آپا نے مل کر جدید انداز و اسلوب کا ایک ادبی جریدہ "داستان

گو" کا اجرا کیا جس نے بہت جلد ادبی حلقوں میں اپنی ساکھ بنالی اس حد تک کہ اس میں شائع ہونا ادیب کے لئے سٹیٹس سمبل قرار پایا۔ وہ معروف ہفت روزہ "لیل و نہار" کے بھی مدیر رہے اور ان دونوں پرچوں کی ترتیب میں ان کی شخصیت کی چھاپ واضح طور پر محسوس کی جا سکتی ہے۔

اشفاق + بانو ..... اردو ادب کی معروف اور بے حد پسندیدہ جوڑی تھی۔ ان کی داستان سرائے دراصل مہمان سرائے تھی، ہم دوست وقت بے وقت آتے، چائے پیتے گپ کرتے اور اشفاق صاحب کی باتوں سے رس حاصل کرتے۔ یہ دونوں منفرد قسم کی پارٹیاں دیا کرتے تھے، ایک مرتبہ طرح طرح کے ملا لوگ بلا کر ہم دس بارہ دوستوں کو ان سے ملوایا یہ کہہ کر "ہم لوگ ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں لیکن ذرا مکالمہ تو کر کے دیکھیں" چنانچہ ہم لوگوں کی دلچسپ گفتگو رہی۔ اسی طرح ایک مرتبہ ایک میجک ماسٹر کو بلایا اور ہم سب نے ان کے پوتوں اور پوتیوں کے ساتھ، ان کی کوٹھی کے لان میں جادو کے کھیل تماشے دیکھے اور کوئی نصف صدی بعد میں نے اپنے اندر کے بچے کو خوشی سے تالیاں بجاتے پایا۔

اور پھر داستان سرائے کا بوڑھا دانش مند داستان گو خاموش ہو گیا!

زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

(روزنامہ جنگ، کراچی ۱۲ ستمبر ۲۰۰۴ء، ماہنامہ ادبِ لطیف لاہور، مئی ۲۰۰۵ء)

سیف الدین سیف

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ

شہابی منڈلی کے ماسٹر مائنڈ اشفاق احمد المعروف ''تلقین شاہ'' ہیں' مگر تعجب ہے کہ شہاب و اشفاق کے مابین ایک حدِ فاصل موجود رہی۔ یہ اشفاق صاحب کی ناکامی ہے کیونکہ وہ گفتگو میں کسی سے ہیٹے نہیں ہوتے اور کسی بھی متین محفل کو اپنی نکسالی بولی سے 'غیر سنجیدہ بنانے کا فن جانتے ہیں۔ ''تلقین شاہ'' کے ''ہدایت اللہ'' سے لے کر ''زاویہ'' کے ہپناٹائزڈ ''چوپالی'' سامعین تک اسی ہنر کی سحر کاری کرشمہ گر ہے' تاہم قدرت اللہ شہاب اس جادوگری کا شکار ہوتے ہوتے رہ گئے۔ ممتاز مفتی نے گواہی دی:

> ''اشفاق احمد نے' قدرت کے ساتھ تو تڑاخ قسم کی گفتگو چلانے کی کوشش کی تھی' جواب میں قدرت نے بھی وہی رنگ اپنانے کی سعی کی۔ قدرت کی یہ کوشش بہت بھونڈی تھی۔ ظاہر تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ قدرت کی شخصیت میں ''او'' اور ''اوئے'' کی صلاحیت موجود نہیں۔'' (''او کھے لوگ'': صفحہ 252)

حالانکہ ''قدرت'' میں یہ قدرت ایک حد تک موجود تھی مگر شاید وہ اشفاق کی سطح پر از خود اترنا نہیں چاہتے تھے۔ مرحوم اتنے مردم شناس تھے کہ وہ مہذب اور منہ پھٹ میں تمیز کر سکتے تھے۔ احمد بشیر نے اشفاق احمد کو ''صرف اپنے خیالات کا پرچارک اور پروپیگنڈے کی خاطر'' تارک الادب'' گرداناہے۔ ''تارک الادب'' کی ذومعنویت سے' شہاب صاحب سے زیادہ اور کون باخبر ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ ان سے لیے دیے رہے اور تعلقات کو اس نہج تک نہیں پہنچنے دیا جہاں ادب قاعدہ اور اکرام و احترام متاثر ہو۔ فن کے حوالے سے بھی اشفاق صاحب ''تارک الادب'' ہو چکے ہیں۔ گل نوخیز اختر

نے اُن کے متعلق بڑے پتے کی بات لکھی ہے:

''انہوں نے صرف اس وقت تک افسانے لکھے جب تک لوگ تصوف لکھنے والے کو ولی سمجھتے تھے۔ جب سے انہوں نے گھر میں کتا رکھا ہے' افسانے لکھنے چھوڑ دیئے ہیں۔ اب وہ اپنی اولاد اور پوتے پوتیوں کی مختلف حرکتوں سے تصوف کشید کر کے' پی ٹی وی کے تعاون سے فی سبیل اللہ بانٹ رہے ہیں۔'' (''حرفِ ملاقات'' صفحہ 383)

گڈریے سے کتے تک کا وجدانی سفر' جدید ترین ادبی مبحث کا ناخوشگوار موضوع سہی مگر اس پر ناک بھوں چڑھانے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اگر ''خواجہ سگ پرست'' ادب کا ''باغ و بہار'' کردار ہوسکتا ہے تو ''سگِ اشفاق'' کے تذکرے میں کیا قباحت ہے؟...... ''سگِ لیلیٰ'' کی تلمیح بھی موضوعِ بحث بن سکتی ہے مگر اس طرح قصہ طوالانی ہوجانے کا خدشہ ہے۔ دینی اعتبار سے اگر چہ کوئی بھی ''کتا پال سکیم'' حلال نہیں مگر ''داستان سرائے'' کی بے بدل کلامی کا کتا' اپنی خردمندی اور جوہر شناسی کے باعث' مستثنیات میں شامل ہے۔ اس کی مردم شناسی کا عالم یہ ہے کہ آنے والوں کی نیت تک بھانپ لیتا ہے۔ وہ فقط ان لوگوں کے قدم لیتا ہے جن سے اُس کے مالکوں کو کام' کام اور صرف کام ہو۔ اشفاق صاحب نے اس کی اخلاق تربیت میں اگر چہ کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی مگر یہ معما تا حال حل طلب ہے کہ اُس نے وفاداری کہاں سے سیکھی؟

o

عزت مآب تلقین شاہ صاحب ایسے نابغۂ عصر ہیں جنہوں نے قلمی منہاج پر نت نئی منزلیں سر کیں۔ ان فتوحات کا روشن تر پہلو' اپنے نظریات کو ملمع سازی سے' سحر سامری کی شکل دینا ہے۔ اس اجتہاد میں وہ لاشریک ہیں۔ مگر اس کا کیا کیجیے' کہ لمحہ موجود کے ادب میں اگر وہ کلاسیکی روایت کی طرح رواں دواں ہیں تو ان کی نگارشات پر بھی معاصر تخلیقات کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ وہ مانیں یا نہ مانیں' ان کے سینکڑوں قارئین' ہزاروں سامعین اور لاکھوں ناظرین کو ان کے افکار عالیہ میں دیارِ غیر کے سرچشموں کا

جاتی تک سنائی دیتا ہے۔ بعض سراغرسانوں نے ان ''مقامات'' کا کھوج لگایا ہے۔ لطیف ساحل کہتے ہیں

''اشفاق احمد کمرشل رائٹر ہیں۔ انہوں نے صوفیانہ رنگ کی جو چادر اوڑھی ہوئی ہے اس کے اندر سے ان کے مفادات کا وجود جھانکتا ہوا نظر آتا ہے۔ انہوں نے واصف علی واصف کی گفتگو کے بہت سے جملے ''باباجی'' کے حوالے سے اپنے ڈراموں میں شامل کر لیے ہیں لیکن اس بات کا کہیں بھی اعتراف نہیں کیا۔''

(''نوائے وقت'' لاہور ادبی ایڈیشن 11 جولائی 2000ء)

مگر وقت تو اعتراف کرا کے رہتا ہے خواہ یہ پادری کے سامنے کسی مسیحی کے ہوں یا دنیا کے سامنے روسو کے..... سناٹوں کی کوکھ سے کوئی نہ کوئی سرگوشی پھوٹ کر رہتی ہے۔ خلاؤں کی وسعتوں میں کبھی نہ کبھی شہاب ثاقب کے شرار خیرگی کا فسوں جگا دیتے ہیں اور کذب و ریا کے متعفن پانی میں آخر کار سچ کا کنول کھل ہی جاتا ہے...... ''چندن کا پیڑ'' اشفاق احمد کے برگ و بار سے سجا تو یہ خوشگوار و دلنواز کہانی نمودار ہوئی:

- ''میں سمجھتا ہوں کہ اب یہ بات کہہ دینی چاہیے اور اس کے کہنے میں کسی قسم کی معذرت کو یا کسی حیلے کو سہارا نہیں بنانا چاہیے اور کسی عذر خواہی کے بغیر اس کا اعلان کر دینا چاہیے کہ میں قدرت اللہ شہاب کا خلیفہ ہوں اور واحد خلیفہ ہوں کیونکہ انہوں نے خود اپنی زبان سے دو مرتبہ واشگاف الفاظ میں بیان دیا تھا کہ ''اشفاق احمد میرا خلیفہ ہے۔ میں اس کو اپنے خلیفے کے طور پر قبول کرتا ہوں اور اس کے لیے دعا کرتا ہوں...... پھر انہوں نے میری بیوی سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ میں اشفاق کے لیے اور اس کے گھرانے کے لیے اور اس کے بچوں کے لیے دعا کرتا رہوں گا اور خداوند کریم سے چاہوں گا کہ وہ میری دعائیں قبول فرمائے اور اس کے گھرانے کو خیر کثیر عطا فرمائے!
- شہاب انعام بر اور فضل بردار نہیں تھا۔ خود انعام اور خود فضل تھا۔ یہ بات،

میں کسی روحانی سلسلے یا تصوف کے حوالے سے نہیں کر رہا' خالص دنیا داری کے رخ سے کہہ رہا ہوں کہ شہاب کے قریب رہنا' خیر کے ساتھ رہنا تھا اور اس کے ساتھ منسلک ہونا' ہر طرح کی بافت سے وابستہ ہونا تھا۔ کبھی کبھی اخباروں میں چھپتا ہے یا لوگوں کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ شہاب کے یاروں نے اس کی ذات سے کس قدر فائدہ اٹھایا ہے تو مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ واقعی جو بھی اس کا یار تھا' خوش قسمت تھا۔ جو بھی اس کے قریب تھا' مالا مال تھا۔ ہم نے اس سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا' اتنا فائدہ کہ کوئی انسان' کسی انسان سے اٹھا ہی نہیں سکتا۔ مال و مال' فارغ البال' پُر باش! ہم تو بہت قریب کے لوگ ہیں' جو شخص اس کی پاس سے بھی گزر گیا' یا اس کے خیال سے بھی گزرا' اس کی زندگی سپھل ہوگئی۔''

(''مردِ ابریشم'': صفحہ 63' 65)

مگر ممتاز مفتی نے اشفاق صاحب کی خلافت کے دعوے کو للکارا ہے اور ان کی بے روح قصیدہ خوانی یا لاف زنی کی قلعی کھول دی ہے:

''اشفاق صاحب' شہاب صاحب کے مسلک پر نہیں چل رہے ہیں' اس لیے اب ان میں اور مجھ میں Difference پیدا ہوگیا ہے۔ ان کی مرضی ہے' چاہے وہ صوفی بن کر بیٹھ جائیں' چاہے اور کچھ بن کر بیٹھ جائیں مگر شہاب کبھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ کوئی آدمی اس کا خلیفہ بن کر بیٹھ جائے۔ شہاب نے تو کبھی یہ تسلیم نہیں کیا تھا کہ میں کچھ ہوں' وہ کسی اور کو کیا تسلیم کرے گا؟''

(رفیق ڈوگر: ''ادبی ملاقاتیں'' صفحہ 86' 87)

محترمہ بانو قدسیہ ''خلیفہ'' کی تاویل کرتے ہوئے دور کی کوڑی لائیں:

''اشفاق صاحب' ان کے ناخن تراشا کرتے تھے۔ اب جو ''خلیفہ'' لفظ ہے' وہ حجام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اور اسی چیز کو ہمارے گھرانے میں فخر سے دیکھا جاتا ہے اور آج تک ہم ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ اشفاق صاحب

قدرت اللہ شہاب کے حجام تھے۔ اب لفظ چونکہ ذومعنی ہے مگر لوگوں نے اسے "خلافت" کے لیے استعمال کیا۔"

("ادبی ملاقاتیں": صفحہ 141)

"خلیفہ" ذومعنی ضرور ہے مگر "چندن کا پیڑ" میں جس سیاق و سباق میں آیا ہے وہاں خالص روحانی فضا ہے۔ دعاؤں اور خیر کثیر کا تذکرہ ہے۔ ایسے میں ذہن کسی "ہیئر کٹنگ سیلون" یا "باربر شاپ" کی طرف قطعی منتقل نہیں ہوتا۔ ویسے یہ ارشادِ گرامی اشفاق احمد صاحب کا تھا تو انہی کو "خلیفہ" کی وضاحت فرمانی چاہیے تھی' نہ کہ محترمہ بانو قدسیہ کو۔ "مدعی سست' گواہ چست" کی مثل ایسے ہی موقع پر استعمال کی جاتی ہے۔ سچ کہا اقبال نے

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

عزت مآب اشفاق احمد صاحب نے اُردو سائنس بورڈ کا ڈائریکٹر بننے کے لیے شہاب کی بیساکھی استعمال کی۔ چنانچہ وہ موصوف کو ماہانہ دو ہزار روپے کی تنخواہ پر یہاں لے آئے جبکہ گزیٹڈ افسر لیکچرار کا مشاہرہ ساڑھے تین سو روپے تھا۔ اعلیٰ قسم کی بڑی گاڑی' ڈرائیور کے خرچ' لامحدود مقدار میں پٹرول کی فراہمی' ان گنت ٹیلی فون کالوں' بجلی اور گیس کے بلوں کی مفت ادائیگی کے باعث یہ ڈائریکٹر صاحب' زندہ ہاتھی کی قیمت پر ایک لاکھ روپے ماہوار میں پڑتے تھے۔ تاہم انہوں نے اپنے محسن کی رحلت کے بعد طوطا چشمی کی جو دستاویز لکھی' اس سے اُن کے باطن کا عکس باہر آ گیا ہے:

"قدرت اللہ شہاب' ایک معمولی دو ٹکے کا آدمی تھا۔ نہ اس کی کوئی عزت تھی' نہ شہرت' نہ ہی کوئی معاشرتی مقام۔ چنانچہ میں نے اور ممتاز مفتی نے سوچا کہ اس کو ایک بزرگ کی حیثیت سے مشہور کر دیتے ہیں۔ ہمارا دوست معروف ہو جائے گا۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ لوگوں نے اس کی عزت شروع کر دی۔ پھر دس پندرہ لکھنے والوں نے مل کر "شہاب نامہ" لکھنا شروع کیا۔ ایک ایک

باب اپنے ذمے لے لیا اور اسے مکمل کر کے' ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرتے
ہوئے قدرت اللہ شہاب کے نام سے شائع کرایا۔ یوں دیکھتے ہی دیکھتے چشم
زدن میں قدرت اللہ شہاب' بابا بھی بن گیا اور ادیب بھی۔''
(''گفتگو'': صفحہ 17)

اسے کہتے ہیں ''بڑ ہانکنا!'' ...... واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کی پانچویں دہائی میں جب سعادت حسن منٹو کی شہرت کا سورج نصف النہار پر تھا' اردو کے افسانوی ادب کے افق پر کئی نئے لکھنے والوں کے نام روشن ہو رہے تھے۔ ان میں ایک نام قدرت اللہ شہاب کا بھی تھا جو برطانوی آقائیت کی غلام گردشوں کا سیلانی اور فطرت انسانی کے نہاں خانوں کا بھیدی تھا۔ وہ اس زمانے میں کامیاب تخلیقی افسانہ نگار کے طور پر پہچانے جا چکے تھے' جبکہ اشفاق احمد انگریزی فکشن کے تراجم کر کے اور اپنے نام کے ساتھ ''بی۔اے'' کا لاحقہ لگا کر اپنی ''علمی برتری'' کے احساس کی تسکین کرتے تھے۔ یہ زمانہ قیام پاکستان کے فوراً بعد کا ہے۔ اشفاق احمد خود لکھتے ہیں:

''ہم چار بندے تھے جن میں سے ایک پروفیسر اشفاق علی خان' دوسرے قدرت اللہ شہاب اور تیسرے مسعود کھدر پوش تھے۔ ان تینوں دوستوں کے نیچے میں' بالکل جیسے شامل باجہ ہوتا ہے' ان کے ساتھ ساتھ رہتا تھا۔ ان دنوں مسعود کھدر پوش نے ایک سلسلہ شروع کر رکھا تھا کہ اذان پنجابی میں دی جانی چاہیے۔ چنانچہ میں جہانگیر کے مقبرے پر اذان دیا کرتا تھا ... ''اللہ وڈا! اللہ وڈا!'' لوگ بڑے حیران ہو کر دیکھتے تھے۔ لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کا یہ ایک ذریعہ تھا۔ پروفیسر اشفاق علی خان منع کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یار یہ تو واہیات آدمی ہے' تم کس کے پیچھے لگے ہوئے ہو؟ پھر عجیب اتفاق یہ ہوا کہ میں اشفاق علی خان مرحوم کا شاگرد بن گیا۔ (پطرس) بخاری صاحب نے اہتمام کیا کہ گورنمنٹ کالج میں اردو کی کلاسوں کا اجراء کیا جائے۔ صوفی (تبسم) صاحب نے اصرار کیا کہ ایم اے میں داخلہ لو۔ میں

نے کہا جی' بی اے کر لیا ہے' بہت بڑی ڈگری ہوتی ہے۔ بہر حال ان کے تقاضے پر ایم اے میں داخلہ لے لیا۔'' (''راوی'': 2001ء : صفحہ 139)

بی اے کی بڑی ڈگری ملے یا ایم اے کی معرفت کا مرحلہ طے ہو' سوچنا یہ ہے کہ کیا اب ''اللہ وڈا'' نہیں رہا؟ اس اعلان کبریائی کے لیے اب جہانگیر کے مقبرے پر جانے کی توفیق کیوں نہیں ہوتی؟ ہاں اگر اعصاب جواب نہ دے گئے ہوں تو ''داستان سرائے'' کے بالا خانے کی چھت بھی' اس نیک کام کے لیے غیر موزوں نہیں۔ لیکن اس صورت میں خدشہ یہ ہے کہ لوگوں کی توجہ ضرورت سے زیادہ حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ' دیگر مفادات بھی خطرے میں پڑ سکتے ہیں حتیٰ کہ جانِ عزیز بھی۔ چنانچہ اس معاملے میں ''داستان سرائے'' کے بالمقابل براجمان' پنجاب کی آن فخر زمان پر بھی تکیہ نہیں کیا جا سکتا۔ ویسے پنجابی میں اذان جیسا احسان چڑھانے اور اردو میں ایم اے کرنے کے باوجود اشفاق احمد کی سوئی آج بھی بی اے پر رکی ہوئی ہے بلکہ وہ تو قوم کو اپنے ڈراما نما ڈراموں کے ذریعے بی اے سے بھی کم تعلیم دلانے کا بھاشن دیتے رہتے ہیں۔

o

1949ء میں منٹو نے ''قلم قتلے'' کے تحت' انہیں ادبی دنیا کے ''تازہ واردان'' میں شمار کر کے' ان کا تعارف ان الفاظ میں کرایا تھا:

''نام: اشفاق احمد خاں...... جائے پیدائش: سکھوں کا متبرک شہر' مکیسر ...... تقسیم پر ہجرت کی تو خان وہیں رہ گیا ...... اب صرف اشفاق احمد ...... باپ سلوتری...... ہارس سنس یعنی اپی حس ورثے میں آئی...... موجودہ مشاغل: برف سازی اور افسانہ نویسی!''

(''اردو ادب'' شمارہ 2 صفحہ 54: 1949ء)

اگر اشفاق صاحب ایم اے اور بی اے' پیش رو اور پس رو' تخلیق کار اور مترجم کا فرق جانتے ہیں تو آخر انہیں کس مالیخولیائی ترنگ میں یہ مغالطہ ہو گیا ہے کہ شہاب کی

شہرت ان کی مرہونِ منت ہے' حالانکہ ان سمیت متعدد افراد کو ادبی منظرنامے پر لانے اور سرکاری و غیر سرکاری مراعات دلانے میں قدرت اللہ شہاب نہایت خلوص سے سرگرم رہے۔ اپنے محسن شہاب مرحوم کے ساتھ اشفاق احمد کا یہ رویہ دیکھ کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا یہ قول مبارک یاد آتا ہے...... ''جس پر احسان کرو' اس کے شر سے ڈرو!''......

میاں محمد بخش کا یہ شعر اسی فرمان کی علامتی تفسیر ہے

نیچاں دی اشنائی کولوں فیض کسے نہ پایا
کِکّر تے انگور چڑھایا' ہر گچھا زخمایا

اکثر عظیم شخصیات کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی قبر پر مٹی ڈالتے ہی' ان کا ہر خوشہ چیں خود کو Six Million Dollar Man تصور کر لیتا ہے۔ احمد ندیم قاسمی' منٹو کی زندگی میں خود کو نمبر ون افسانہ نگار اور فیض کے عین حیات عظیم ترین شاعر نہیں کہتے تھے (سمجھتے تو ہوں گے!) مگر دونوں کے سانحۂ ارتحال کے بعد' انہوں نے لاؤ لشکر سمیت' لاشریک و بے مثال ہونے کا ڈھول زور زور سے بجانا شروع کر دیا جس کی گرم دھم کا جوش و خروش' ان کے جشن سالگرہ پر دیدنی و شنیدنی ہوتا ہے۔

اشفاق احمد صاحب کے یہ دعوے غلط بیانیوں کے بھی شاہکار ہیں۔ جہاں تک شہاب کے خاندانی مقام اور معاشرتی احترام کا سوال ہے' وہ نجیب الطرفین تھے۔ ان کے والد (عبداللہ) گلگت کے گورنر تھے۔ دیسی' بدیسی ممتاز افراد سے ان کے مراسم رہے۔ اہم برطانوی شخصیات لارڈ کچز اور سر میلکم ہیلی' ان کے دوستوں میں شامل تھے۔ کشمیری رہنماؤں...... چودھری غلام عباس اور شیخ عبداللہ کی تحریکی سرگرمیوں کے عقب میں بھی عبداللہ صاحب استادہ نظر آتے ہیں۔ شہاب صاحب کی ذاتی عزت' ان کا کامیاب سینئر بیوروکریٹ ہونا ہے۔

رہی شہرت تو وہ ان کے پہلے افسانے چندراوتی (مطبوعہ مجلّہ ''رومان'': 1939ء) سے' خوشبو کی مانند ادب زار میں پھیل چکی تھی۔ مجلّہ ''ادبی دنیا'' میں ان کا افسانہ ''پکے پکے آم'' شائع ہوتے ہی دھوم مچ گئی۔ ڈاکٹر انور سدید کے بقول:

''افسانے کے تعارف میں اُن (مولانا صلاح الدین احمد) کے پاس تعریف وتحسین کے جتنے الفاظ تھے' انہوں نے خرچ کر ڈالے ... ایک نئے شہاب ثاقب کی نوید دی۔ جب اُن کا ایک اور افسانہ ''پھوڑے والی ٹانگ'' شائع ہوا تو اہل ادب نے دیکھا کہ مولانا صلاح الدین احمد نے اس کی بھی بے پناہ تعریف کی' اور انہوں نے اب جو اسمائے تفضیل استعمال کیے' ان کے سامنے سابقہ مرکب ہائے توصیفی بھی ماند پڑ گئے۔''

(ماہنامہ ''قومی زبان'' اکتوبر 1988ء: صفحہ 61)

یہ احوال' بیسویں صدی کی پانچویں دہائی کے آغاز کے ہیں' جب معروف افسانہ نگار کی حیثیت سے شہاب صاحب کا مقام تسلیم کیا جا چکا تھا' لیکن تلقین شاہ صاحب اس زمانے میں' ہر اعتبار سے گھٹنوں کے بل چل رہے تھے۔ یوں وہ ان تمام اوصاف سے متصف تھے جو موصوف نے اپنے صوفی صافی حضرت شہاب علیہ الرحمہ پر تھوپے۔ ان ارشادات پر انسانیات کا طالب علم حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ معاً اشفاق صاحب کی ذہنی کائنات میں گڑ بڑ کا گمان بھی گزرنے لگتا ہے کہ ایسے فرمودات کسی باوقار انسان سے سرزد ہونا تو ممکن نہیں۔

اس مقام پر تاریخ کا پھنیر سانپ پلٹ کر شوکر مارتا ہے اور آواز آتی ہے کہ کیا جو شخص پاکستان کا سب سے زیادہ بااختیار بیوروکریٹ ہو' جس کی شہرت کا بگل نہ صرف سرکاری ایوانوں میں بج رہا ہو بلکہ ایک مخصوص اسلوب کے کہانی کار کی حیثیت سے ادبی دنیا میں اس کا مرتبہ بھی تسلیم کیا جا چکا ہو' اُسے دو ٹکے کا آدمی کہنے کا جواز کیا ہے؟ ایسا بیان جاری فرما کر اشفاق صاحب تو خود دوکوڑی کے بھی نہیں رہے۔ اس مرحلے پر' ان کے ہمدم و ہمراز ممتاز مفتی' بھول بھلیاں میں راستہ دکھاتے ہیں:

''اشفاق احمد کے سارے ''بابے'' فراڈ ہیں' کہانیاں ہیں۔ وہ نرگسیت کی انتہا کو پہنچا ہوا شخص ہے' جسے اپنے سوا' دنیا میں کوئی نظر نہیں آتا۔ اشفاق احمد' شہاب نامہ اپنے کسی پبلشر دوست کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ شہاب نے مجھ سے رائے لی۔ میں نے منع کر دیا۔ انہیں پبلشر سے تحریری معاہدے پر قائل

کرلیا تو اشفاق ایک ایسا معاہدہ تیار کر کے لے آیا جس کا تمام تر فائدہ اسے پہنچتا تھا۔''

(''انٹرویو'' روزنامہ'' پاکستان'' لاہور: 2 نومبر 1995ء)

ممتاز مفتی نے صدیق رائی کے نام اپنے مکتوب (محررہ 7 مارچ 1988ء) میں اشفاق احمد کی اصلیت ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''میں نے اشفاق کو اپنے ذہن کا پھوڑا بنا لیا ہے۔ اشفاق اور بانو نے جو رویہ شہاب کے متعلق اختیار کر رکھا ہے' وہ میرے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ وہ شہاب کو اپنی پبلسٹی کے لیے برت رہا ہے اور جو کتاب وہ پیش کرنے کا ارادہ رکھتا ہے' اس کا مقصد ہی خود کو بوسٹ کرنا اور پیسہ کمانا ہے۔ اشفاق نے شہاب کو یوں استعمال کیا جیسے وہ ٹوتھ برش ہو...... اشفاق کے ٹی وی پروگرام نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی۔ اس نے ''شہاب نامے'' پر یوں بات کی جیسے وہ شہاب کو ایک مصنف کی حیثیت کے علاوہ جانتا ہی نہ ہو چونکہ اشفاق منافقت کر رہا ہے' وہ بہت بڑا انا پرست ہے' ہم دونوں کا ناطہ قائم نہیں رہ سکتا!''

(''قدرت اللہ شہاب...... ہمہ جہت شخصیت'': صفحہ 191)

طارق اسد نے شاید گنبد انا کے اسیر پر تقصیر کسی ایسے ہی شخص کے متعلق کہا تھا:

اسے خود سے محبت ہے' اسے اپنی ہی خواہش ہے
اسے اپنے سوا کوئی بشر اچھا نہیں لگتا

تاہم اچھا لگنے کے لیے اسے خود سے زیادہ اچھوں کا آسرا لینا پڑے گا۔ چنانچہ خانقین شاہ نے عمر بھر یہی کچھ کیا۔ اصغر ندیم سید کا کہنا ہے:

''اشفاق صاحب بہت ہوشیار قسم کے'' بابا سپیشلسٹ'' ہیں۔ وہ اپنے'' بابے'' بدلتے رہتے ہیں' جیسے بعض سیاست دان پارٹیاں بدلنے میں مشہور ہوتے ہیں۔ جیسا زمانہ ہوتا ہے' ویسا ہی اشفاق صاحب کا بابا ہوتا ہے۔ چونکہ اشفاق صاحب کو تمام عقل کی باتیں وہ بابا بتاتا ہے' اس لیے زمانے کے مطابق' وہ بابا اسی حساب سے رکھتے ہیں۔ ان کی مہربانی ہے کہ وہ ہمیں وقتاً فوقتاً اپنے

بابوں سے ملاتے رہتے ہیں کبھی مغل پورے کا بابا' کبھی شیخو پورے کا بابا' کبھی ننکانہ صاحب کا بابا' ایک زمانہ تھا' اشفاق صاحب حضرت واصف علی واصف کی صحبت میں گیان حاصل کرتے تھے۔ پھر پتہ چلا' قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی اُن کے گرو ہو گئے ہیں۔'' (''راوی' 2001ء : صفحہ 117)

اشفاق صاحب نے' مرزا محمد منور کی صورت میں ایک ''لاہوری بابا'' تراشنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اس اقبالی مرید نے اُن کی پیشکش ٹھکرا دی۔ مرزا صاحب کے فکری وارث پروفیسر محمد یوسف عرفان راوی ہیں کہ اشفاق احمد اور واصف علی واصف نے سانده (لاہور) میں کئی بار مرزا صاحب سے ملاقات کی اور ملتجی ہوئے:

''ہمیں روحانی اعتبار سے بار بار اس امر کا اشارہ دیا گیا ہے کہ ہم آپ کے دست مبارک پر بیعت کریں اور آپ کی رہنمائی میں' علامہ اقبال اور قائداعظم کی تعلیمات اور مقاصد کے مطابق' پاکستان کو دینی و دنیوی لحاظ سے اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچانے کے لیے سعی کریں۔ واصف علی واصف اور اشفاق احمد نے مرزا صاحب کو یہ بھی بتایا کہ قدرت اللہ شہاب بھی ان کے ساتھ بیعت کرنے والوں میں شامل ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں خاص طور پر اسلام آباد سے لاہور آنا تھا مگر انہیں بوجوہ لاہور کا سفر عین موقع پہ ملتوی کرنا پڑا۔ مرزا صاحب نے اپنی صحت کا عذر پیش کیا اور کہا کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں۔ صحت ساتھ نہیں دیتی۔ آپ لوگ ''جوان'' ہیں۔ علامہ اقبال اور قائداعظم کی تعلیمات کی روشنی میں قوم کی قیادت کریں۔ میں آپ کے ساتھ حسبِ توفیق شامل رہوں گا۔ رہا مسئلہ بیعت کا تو میں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔'' (''مرزا محمد منور اور تربوزی ادیب'' غیر مطبوعہ)

مرزا صاحب ان تربوزی ادیبوں کی خصلت سے آگاہ تھے۔ ان کی چھٹی حس نے یقیناً انہیں بچھا دیا ہوگا کہ اشفاق احمد' انہیں زینہ بنا کر ''اردو سائنس بورڈ'' کے راکٹ

کے بعد، شاید "اقبال اکادمی پاکستان" کے جمبو جٹ تک پہنچنے کے چکر میں ہیں تا کہ پرواز میں کوتاہی کا تدارک کیا جا سکے۔ رہے شہاب صاحب تو اس "تحریک" میں ان کی شمولیت کے حوالے سے دو امکانات ہیں۔۔۔ اول یہ کہ انہیں اس ملاقات کا سرے سے علم ہی نہ ہو اور ان کا نام نامی محض زیبِ داستاں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہو۔ دوسری صورت میں یہ شہاب صاحب کی ترپ چال ہو سکتی ہے یعنی پہلے اپنے سفیر بھیج دیئے تا کہ اگر لائن کلیر ہو تو بعد میں خود بھی پہنچ جائیں اور کوئی نئی "بساطِ طریقت" بچھا کر معرفت کی کچھ اور منزلیں سر کر لیں۔

o

اشفاق احمد نے، سہیل وڑائچ سے، دنیا جہان کے موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے باطنی سفر در سفر کا واراداتی نقشہ یوں کھینچا:

جنگ: تلقین شاہ زیادہ مشہور ہے یا اشفاق احمد؟

اشفاق احمد: پہلے تلقین شاہ زیادہ مشہور تھا، پھر اشفاق احمد ہوا، اب ایک اور چالاک آدمی مشہور ہے، صوفی صاحب!

جنگ: آپ کو ان میں سے کون پسند ہے؟

اشفاق احمد: مجھے تو سارے ہی پسند ہیں۔ ان سے نیک نامی ہوتی ہے اور عزت ملتی ہے، لیکن میں صوفی نہیں بن سکا۔ صوفی کی سطح زمین سے تھوڑی اونچی ہوتی ہے۔ میں تو گلیوں میں چلنے والا آدمی ہوں۔ کاش میں ایسا ہو سکوں اور مرنے سے پہلے دو دن بھی ایسے مل جائیں تو بڑی خوشی کی بات ہوگی۔

جنگ: مناظر فطرت میں کیا پسند ہے؟

اشفاق احمد: مناظر فطرت میں مجھے صحرا اچھا لگتا ہے۔ اس لیے کہ صحرا میں ایک وسعت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ میرا ایک تاثر بھی ہے کہ صحرا، پیغمبر پیدا کرتے ہیں۔ پہاڑ اور غار وغیرہ ولی اللہ پیدا کرتے ہیں۔ یہ میرا اپنا فلسفہ ہے۔ چنانچہ مجھے جب کبھی موقع ملتا ہے، میں تھرپارکر میں جا کر رہتا ہوں۔

(روزنامہ "جنگ" لاہور، سنڈے میگزین، 18 نومبر 2001ء)

یہ اعترافات و ارشادات' مسئول عنہ کی ذات کے نہاں خانے کی صحیح عکاسی کر رہے ہیں۔ پس منظر میں ان ناتمام آرزوؤں اور ناآسودہ خواہشوں کی بھی آنکھ مچولی کھیلتے محسوس کی جاسکتی ہے جنہیں الفاظ کا جامہ پہناتے ہوئے' موصوف رک سے گئے' مگر اہل نظر پہ کشف کا در بخوبی وا ہو رہا ہے کہ وہ ولایت کی مسند پہ فائز ہونے کی مخفی آرزو میں بے طرح بے کل ہیں' تاہم انہیں 1971ء میں' انتظار حسین سے مکالمے کے یہ فرمودات فراموش نہیں کرنے چاہئیں۔

''کہ جنگ کے زمانے میں میرا پروگرام ''داد و لوہار'' بہت کامیاب رہا مگر پاکستان ناکام ہوا اور جنگ ہار گیا۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں بہت دکھی پھرتا رہا مگر ایک بزرگ نے مجھ سے عجیب بات کہی۔ میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ بیٹا' اپنی حیثیت تو دیکھ! انبیاء کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لینا چاہتا ہے' اپنا بوجھ اٹھا!''

(''ملاقاتیں'' صفحہ 52)

لیکن اشفاق احمد' انبیاء کا بوجھ تو خیر کیا اٹھاتے' اپنا بوجھ بھی دوسروں کے کندھوں پہ لادتے رہے۔ کمرشل مفادات کا بارگراں شہاب صاحب سے اٹھوایا۔ گھریلو معاملات اپنی رفیقۂ حیات محترمہ بانو قدسیہ کو سونپے۔ احتساب کی کڑی گھڑیوں میں اپنے اعمال کا پشتارہ' جیلانی کامران کے دوشِ ناتواں پر رکھا اور خود ایک ہاتھ میں قلم اور دوسرے ہاتھ میں مشیخت کا علم تھام کر' چیلے چانٹوں کے ہمراہ حال کھیلنے لگے۔ ایسے میں عطاء الحق قاسمی کا ذوق تماشا' اظہار سے بھلا کیوں کر چوک سکتا تھا۔ چنانچہ ''اشفاق احمد.... بابا بابا کردیاں''..... کی نمود ہوئی

''اشفاق صاحب اب صرف ادیب' افسانہ نگار' ڈرامہ نگار' دانشور اور مفکر ہی نہیں رہے بلکہ بابوں کی کہانیاں سناتے سناتے وہ اب خود ''بابے'' بن گئے ہیں۔ میں نے ایک دن تین چار نوجوانوں کو جنہوں نے کالا لباس پہنا ہوا تھا اور گلے میں منکے تھے' بابا اشفاق احمد کے آستانے پر دو زانو بیٹھے دیکھا۔ میں اشفاق احمد کی صحبت سے اس لیے گریز کرتا ہوں کہ ان کی ساحرانہ گفتگو کا جادو مجھ پر بھی نہ چل جائے اور میں بھی کالے کپڑے پہنے اور گلے میں منکے

ڈالے ان کے آستانے پر بیٹھا "سردائی" گھوٹ رہا ہوں۔"

(" روزن دیوار سے": روزنامہ "جنگ" لاہور 31 دسمبر 2001ء)

جادو چلانے میں اشفاق احمد کا جواب نہیں۔ موصوف نے عمر بھر اسی ہنر کی کمائی کھائی ہے۔ باتوں کے رنگین جال بننا' ان کا وصفِ خاص ہے' جس سے ان کی تحریر و تقریر کا ایوان رونق فزا ہوتا ہے۔ اسی جوہر کے باعث 1950ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں' ان کا رومان پروان چڑھا۔ 1956ء میں سول میرج ہوئی۔ قدرت اللہ شہاب' ممتاز مفتی اور ایکٹر محمد حسین باراتی اور گواہ بنے اور پٹھان خاندان کا روایتی طلسم پاش پاش ہوگیا۔ ممتاز مفتی آنکھوں دیکھی سناتے ہیں:

"وہ محترمہ بڑی چتر کار تھی۔ اوپر سے جدید' اندر سے قدیم' اوپر سے سادمرادی' اندر سے بن ٹھن' اوپر سے ٹھہراؤ ہی ٹھہراؤ' اندر سے جذباتی ہلچل' اوپر ذہن ہی ذہن' نیچے دل ہی دل۔ وہ محترمہ درو پدی اور گیشیا کا سنگم تھی۔ ایک روز محترمہ کالج کے برآمدے سے گزر رہی تھی۔ اشفاق نے سوچا' کوئی منفرد بات کر کے توجہ طلب کروں۔ اس نے ہاتھ پھیلا دیا..... ایک آنہ! صرف ایک آنہ!

"کس لیے؟" محترمہ نے پوچھا۔

"سگریٹ پیوں گا!"

محترمہ نے پرس کھولا' اکنی ہتھیلی پر رکھ دی۔ پس پھر کیا تھا' پنڈورا کا بکس کھل گیا..... مجھے کیا پتہ تھا' یہ لڑکی ایک روز کالی بلی بن کر' اشفاق کی نیم چھتی میں آ کر براجمان ہو جائے گی..... نتیجہ یہ ہوا کہ کمن آباد کے ایک کوارٹر میں' ایک رات مولوی صاحب بیٹھے' اشفاق اور قدسیہ کا نکاح پڑھا رہے تھے۔"

("الکھ نگری": صفحہ 376' 378' 381)

O

سنا ہے پٹھان بڑے روایت پرست اور احسان شناس ہوتے ہیں مگر خان صاحب نے اپنے مربی (شہاب) کے سارے احسانات اور اپنی خاندانی روایات پر خطِ تنسیخ

کیوں کھینچ دیا ہے؟ حالانکہ ان کے سامنے عطاء الحق قاسمی کی روشن روشن مثال موجود ہے جو ہر وقت اُن کے دیدہ و نادیدہ احسانات کی مالا جپتے رہتے ہیں۔ وہ انہیں "بابا" نہ مانتے ہوئے بھی اُن کے سلسلے میں کسی سمجھوتے کے قائل نہیں...... ساغر خالی کا نشہ بھی غضب ہوتا ہے! ابھی ان کے پہلے کالم "اشفاق احمد ..... بابا کردیاں" کی سیاہی بھی خشک نہ ہوئی تھی کہ آٹھویں مہینے کی رعایت سے انہوں نے اپنے ممدوح کو ایک اور ٹرپے "ایوارڈز کا مہینہ" لگا دی۔

"اشفاق احمد کے بعض نظریات سے اختلاف کی گنجائش ہوسکتی ہے لیکن

"ستارۂ امتیاز" ان کی شخصیت سے بہت چھوٹا ایوارڈ ہے۔ یہ ایوارڈ تو ان سے بہت جونیئر لکھنے والوں کو بھی مل چکا ہے۔ اشفاق احمد اردو کے اے پلس افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، صداکار، مقرر اور دانشور ہیں۔ وہ ایک خاص اسٹیج کے لکھاری اور بہت ہی منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ برصغیر میں ان جیسا کوئی اور نہیں ہے۔ اُن کے بیشتر ہم عصروں کو ہلالِ امتیاز مل چکا ہے اور اس سے کم تر کوئی ایوارڈ اشفاق احمد کے شایان شان نہیں ہے.... لہٰذا اس ایوارڈ پہ نظرثانی ہونی چاہیے تاکہ "حق بہ حقدار رسید" والی بات اس ضمن میں دہرائی جاسکے۔" (روزنامہ "جنگ" لاہور 20 اگست 2002ء)

"تمغۂ امتیاز" واقعی حضرت اشفاق احمد قبلہ کے شایان شان نہیں بلکہ شاید "پرائڈ آف پرفارمنس" بھی ان کی یگانۂ روزگار شخصیت کے لیے موزوں نہیں، کیونکہ وہ ان سے جونیئر افراد کو مل چکا ہے جن میں قاسمی صاحب بھی شامل ہیں... ایسے میں کیوں نہ "باباجی" کے اسمِ گرامی سے منسوب ایک ایوارڈ "نشانِ اشفاق" کا اجرا کر دیا جائے جو ہر سال مادی و روحانی فیوض و برکات کے جلو میں صرف ان مستحقین کو عطا ہو جو اپنے "نصب العین" کی خاطر سرحدِ ادراک سے گزر جانے کی توفیق رکھتے ہیں اور الحمدللہ "سلسلۂ اشفاقیہ" میں ایسے "سردائی" گھوٹنے والے سیاہ پوش عقیدت مندوں کی کوئی کمی نہیں!

(سیف الدین سیف کی کتاب "شہاب بے نقاب" سے اقتباسات)

شاہین مفتی

مورِ بے مایہ

ایک دن وہ اُس دخترِ دہقاں کی تلاش میں قرطبہ گیا تھا جو آبِ روانِ کبیر کی متوازن لہروں کی دُھن پر محبت اور شانتی کے گیت گاتی ہے۔ اور جس کی سنگت میں شاعرِ مشرق نے کسی اور ہی زمانے کے خواب دیکھنے کی ابتداء کی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ مسجد کے حافظ کا فرمان تھا۔ مسجد خدا کا گھر نہیں ہوا کرتی۔ ورجن میری اور اُس کے بیٹے کی شبیہ اُس عمارت کی ناپاکی اور پلید روحوں کو بھگانے کا نسخۂ تیرِ بہدف ہے۔ اپنی تلاش میں نکلا ہوا اشفاق خالی ہاتھ لوٹا تھا، حالانکہ وہ ان شہروں کی گلیوں میں، اُن کے بازاروں میں، اُن کے مکانوں میں، اُن کی نازنینوں میں اپنے آپ کو ''مور'' کہہ کہہ کے منوانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اس بات پر بضد رہا کہ ان مور یہ نسل مسلمانوں نے ہسپانیہ میں تہذیب کی بنیاد ڈالی تھی۔ اُنہوں نے یہاں کے رہنے والے لوگوں کو کھجوروں کے تحفے پیش کئے تھے۔ اُنہوں نے علم کے چراغ جلائے تھے لیکن اُسے یہی سننا پڑا کہ یہ بربر، مُور مسلمان قصائی اور سنپولئے تھے۔ اشفاق کی ازابیلا اُسے مُوروں کی بستی میں بُل فائیٹنگ کے میدان میں گھسیٹ لائی تھی۔ انسانی زندگیوں سے جانوروں کا سا سلوک کرنے والے اہلِ روم مسلمانوں کو ظالم اور دہشت گرد قرار دے رہے تھے۔ اس سفر کی واپسی پر دریائے کبیر کا گدلا پانی کچھوؤں کی مردہ لاشوں اور سؤروں کے غول سے اٹا پڑا تھا اور اشفاق اپنی تنہائی میں بائیں ہاتھ سے چھاتی بجا بجا کر شور مچا رہا تھا کہ ''مَیں مُور ہوں''۔

شاید روم کے اس سفر نے اُس سے وہی سلوک کیا تھا جو ہمالہ کی شان میں قصیدہ پڑھنے والے اقبال کے ساتھ انگلستان کے سفر میں پیش آیا۔ دونوں کی قلبِ ماہیت ہوئی، دونوں غمزدہ ہوئے اور پھر دونوں تمام عمر محراب و منبر سے نیچے نہ اُتر سکے۔

۲۰۰۴ء کے کسی دِن اشفاق اس دنیا سے چلا گیا۔ اُس کے اُجلے پھول پانی میں تیرتے رہے۔ گڈریا اپنی بھیڑوں کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود گم ہو گیا۔ وہ شاید ابسن کے کسی ڈرامے سے اُبھرا تھا۔ پھر بس اُس نے جیتے جی دنیا کے اس سمندر میں اپنی زندگی کو ایک جہاز ہی سمجھا...... جہاز جس کی سب سے زیادہ معنی خیز اور دُور مار چیز مستول ہی ہوتی ہے۔ یہی مستول اُس کا منبر ثابت ہوا۔ اپنی کہانی

سنانے کے لئے وہ خود ہی بچا تھا۔ باہمی اشتراک کی چالاکیوں سے چلنے والی اس کاروباری دنیا میں تہذیبوں کے نسلی اختلاط اور انسانی منافقت کے شعوری و لاشعوری رشتوں کے بارے میں اُس کا لامتناہی وعظ اختتام پذیر ہوا۔ اب اُس نے اپنا چہرہ ڈھک لیا ہے۔ لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اور اُن کی رخصتی کا تماشا دیکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے شامیانوں، دریوں، دیگوں اور قُل پر بٹنے والے پھلوں کے فروعی نظام سے الگ بھی کچھ ہے۔ جو اس "کچھ" کے بارے میں سوچ کا تکلیف اُٹھائے گا اور جو تکلیف اُٹھائے گا وہی تخلیق کرے گا۔ اس موضوعاتی وضاحت کے لئے اب ہم اسے کبھی زحمت نہیں دے سکیں گے۔ سچ ماہیے! ابھی تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔ اب ہے فنکار اپنی لامتناہی تنہائی کے جنگل میں۔ کیا خبر اُسے دشت کی یہ پہنائی ڈرا رہی ہو اور کیا خبر اُس نے خُلد مکانی سے جنت لامکانی کے اس سفر کو "سفرِ مینا" کی آخری اُڑان سمجھا ہو جو اس لحۂ موجود میں کہیں شاخِ برزخ سے لٹکی معرکۂ خیر و شر دیکھتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا کہ اب کی بار وہ "دتو" ملنگ کی طرح گریٹوئیشن اور لیوٹیشن کے ہمہ گیر تجربے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچ رہا ہو۔

"ہر شے مسمار ہو گئی ہے اور ایک نئی دنیا جنم لے رہی ہے۔" (سفر در سفر، ص ۲۵۷)

وہ تمام عمر ہر کسی کا دل لبھاتا رہا۔ ہر ایک کے نخرے اُٹھاتا رہا۔ ہر ایک کا رانجھا راضی کرتا رہا۔ لیکن پکڑائی نہیں دیا۔ وہ ایک ایسا صاحبِ حال تھا جس کی تعلیم میں ہر طرح کا کوڑا کرکٹ اور گدڑ پھوس بھرا ہوتا ہے۔ کثافت سے لطافت پیدا کرنے کا یہ تجربہ اُس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا کہ "صاحبِ حال" ہونے کا یہ فیشن اُس نے کب اپنایا۔ اُس وقت جب وہ اپنی بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ فیروز پور۔ واہگہ بارڈر میں داخل ہوا یا اُس وقت جب مقامی لوگوں نے عدمِ قبولیت کے گہرے جذبات کے ساتھ مہاجر کہہ کر اُس کا ہاتھ جھٹکا، یا اُس وقت جب اُس نے ہاتھ جھٹکنے والوں سے انتقام لینے کے لئے ذرائع ابلاغ کی مدد سے اپنی زبان کا تعفن پھیلانے کی شعوری کوشش کی۔ لوگ اشفاق احمد کو بھول گئے۔ ہدایت اللہ اور تلقین شاہ، نذیر احمد دہلوی کی اصغری اکبری، اور نصوح و کلیم کی طرح ہر گھر کے مستقل فرد بن گئے۔ اُس کی ارادت، شخصی مقناطیسیت نے وہ کمال پیدا کیا جس کے بارے میں اُس کا مرشد اقبال کہہ گیا تھا:

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

وہ اُن پٹھانوں میں سے تھا جو غیرت کے نام پر قتل کرتے ہیں اور مقتولوں کے نام تک یاد نہیں رکھتے۔ اُس کے پٹھان باپ نے محبت کے نام پر اُس کی انانیت، توقعات اور خونی رشتوں کا جس طرح خون کیا، اشفاق اپنے دل سے اُن کھرونچوں کے نشان کبھی نہیں مٹا سکا۔ اُس وقت بھی نہیں جب وہ اپنے

بڑے بھائی کو خون کا نذرانہ پیش کر رہا تھا۔ یہ بے بضاعتی اُس کی تحریروں میں محبت کا وہ لاوا بن کر اُبھری ہے جس نے اغیار کو اُس کا یارِ غار بنا دیا ہے۔ ایک لمحے کے اس دھتکارے جانے کا اولین احساس اشفاق کی ساری داستان رنگین کر گیا ہے۔ زندگی کے عرفان کی اس کڑی نے اُسے غریبوں کی حمایت اور درد مندوں کی محبت عطا کی ہے۔ دستِ شفقت کی عدم موجودگی دو طرح کے رجحانات پیدا کرتی ہے۔ یا تو انسان مفعولیت کے درجے کو اپنا مقسوم سمجھتا ہے یا آپ ہی اپنے مقدر کا ستارا بن جاتا ہے۔ اشفاق نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا ہے۔ اپنی کمزوری کے اعتراف کو اپنی طاقت سمجھ کر وہ کئی کمزوروں کا محافظ بن گیا۔ یہی اُس کی قلعہ کہانی ہے۔ شکست اور اعترافِ شکست کے مابین انسانی زندگی کی عجیب رمز چھپی ہے۔ جب ستارے ٹوٹتے ہیں اور زمین کا رُخ کرتے ہیں تو کوئی نہیں جانتا شہابِ ثاقب کی قسمت کیا ہوگی؟ اشفاق نے بنیادی خاندانی نظام سے گرہ کشائی کا وہی حل تلاش کیا ہے جو کثرت کو وحدت میں تبدیل کرتا ہے۔ جس طرح گوتم ایک دن اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر نروان کی تلاش میں نکلا تھا، اُسی طرح اشفاق بھی سچائی زندگی کی کٹھنائیوں میں کہیں نہ کہیں ایسا مقام تلاش کر لیتا ہے جہاں وہ مقامی دانش کو آفاقی دانش پر غالب آنے کے داؤ پیچ سکھا سکے۔ اس دوہرے عمل نے اُس کی شخصیت میں ایک خاص وضع کی مرعوبیت پیدا کی ہے۔ اس حیرت کدے میں اُس نے اپنی ذات کے لئے جو پرسونا منتخب کیا ہے وہ اُس کی دانش کا مکمل ثبوت ہے...... لیکن یہ کائنات ایک وھیل مچھلی ہے جس پر مکمل گرفت اپنی طرز کی دیوانگی ہے۔ ہرمن میلول کے ناول ''موبی ڈک'' کا ہیرو کیپٹن اہاب اسی مقدس دیوانگی کا عجیب وغریب نمونہ ہے۔ شاید اشفاق نے بھی اُسی کی طرح موجودگی اور عدم موجودگی کی یگانگت کا انفرادی تجربہ کیا ہے۔ اس تجربے کے اثرات دیر تک محسوس کئے جائیں گے۔ اقبال کی اس دعا کی طرح:

مورِ بے مایہ کو ہمدوشِ سلیماں کر دے

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے

شاید کوئی دن نجات اور سرفرازی کا دِن ہو اور اشفاق اپنا سینہ ٹھونک کر اہلِ دنیا کو بتا سکے کہ وہ ''مُور ہے اور مُور اچھے لوگ ہوتے ہیں۔''

(سہ ماہی فنون لاہور، ستمبر۔ دسمبر ۲۰۰۴ء)

عرفان احمد خان

اُردو کا آخری داستان گو

اشفاق احمد کی وفات سے جہاں بانو قدسیہ نو ان دن خاوند سے محروم ہوئی ہیں، وہیں اردو زبان بھی اپنے آخری داستان گو کی موت کے صدمے سے دوچار ہے۔ یہ بات درست ہے کہ داستان گو اصل میں بادشاہوں اور نوابوں کی ضرورت ہوا کرتے تھے۔ اب نہ بادشاہت رہی، نہ ہی نوابیاں رہیں تو پھر داستان گو کو کون پالتا پوستا۔ چنانچہ یہ نسل نایاب ہو کر رہ گئی۔ نوابوں اور بادشاہوں کی ضرورت داستان گو کچھ اس طرح سے تھے کہ اُن کی داستانوں میں ڈوب کر وہ لوگ اپنے ضمیر کی خلش مٹایا کرتے تھے۔ عوام کے ساتھ کی گئی ناانصافیاں نہ صرف بھول جاتے تھے، بلکہ مزید زیادتیاں کرنے کے لیے تازہ دم بھی ہو جاتے تھے۔ رہی بات عوام کی کہ وہ ایسے داستان گو کو کیوں پسند کرتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جس طرح فاقہ زدہ بچوں کو ماں حیلے بہانوں سے کہانیاں سنا کر بھوک سے توجہ ہٹانے اور کسی طرح سلانے کی کوشش کرتی ہے، وہی کردار داستان گو اس پچھلے ہوئے معاشرے میں ادا کرتے تھے۔ اُن زمانے میں ریڈیو، ٹی وی اور فلم جیسے ذرائع ابلاغ تو تھے نہیں جن سے عوام اپنا دل بہلاتے۔ لے دے کے یا تو طوائفوں کے کوٹھے تھے یا پھر داستان گو کی بیٹھک تھی یا قہوہ خانہ۔ کوٹھے ظاہر ہے اونچے لوگوں کے لیے تھے جبکہ بیٹھک یا قہوہ خانہ عوام کی دسترس میں تھا۔ چنانچہ اس زمانے میں داستان گو معاشرے کا ایک لازمی سا حصہ تھے۔ وہ نا صرف خود افیون سے شغل فرماتے تھے بلکہ اُن کی کہانیاں بھی عوام کے لیے افیون ہی کا درجہ رکھتی تھیں اور وہ اپنے دکھ اور مسائل داستان گو کی داستان میں محو ہو کر وقتی طور پر بھول جاتے تھے لیکن مسائل جوں کے توں رہتے تھے۔ گویا داستان گوئی کی یہ روایت ماحول اور ذمہ داریوں سے فرار

کا ایک باعزت راستہ تھی۔

بات اگر عوام کے مسائل حل کرنے کی ہو تو اس میں نہ تو کوئی کردار بادشاہوں اور نوابوں کا ہے اور نہ ہی داستان گو کا۔ عوام کے مسائل سائنس نے حل کیے یعنی سائنس دانوں نے۔ اب اشفاق احمد کو یہ دوہرا اعزاز حاصل ہے کہ وہ داستان گو بھی تھے اور سائنس سے متعلق بھی۔ یعنی وہ اُردو سائنس بورڈ کے ڈائریکٹر جنرل بھی رہے۔ وہی سونے پر سہاگے والی بات ہوئی۔ اب اگر اشفاق احمد کی سوانحی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں اُس اشفاق احمد کا سراغ ملتا ہے جو اُردو ادب میں بطور افسانہ نگار آیا تھا اور اپنے زمانے کے فیشن کے مطابق اپنے نام کے ساتھ ''بی اے'' بھی لکھتا تھا۔ سعادت حسن منٹو اور محمد حسن عسکری نے ''اُردو ادب'' کے نام سے ایک ادبی رسالہ جاری کیا تھا' جس میں اشفاق احمد کا تعارف ان الفاظ میں کروایا گیا تھا: ''سکھوں کے متبرک شہر مکتسر میں پیدا ہوئے۔ ادبی حس والد کی طرف سے پائی۔ اشفاق احمد پاکستان چلا آیا۔ ''خان'' ہندوستان ہی میں رہ گیا۔'' لفظ ''خان'' سے یاد آیا کہ انگریز کے زمانے میں اپنے چمچوں کڑچھوں کو ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازا جاتا تھا۔ یا پھر گویے اور میراثی ''خان صاحب'' کے لقب سے سرفراز ہوتے تھے۔ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ کسی نے ''خان'' کے اضافے کو فالتو خیال کرتے ہوئے اپنے نام سے علیحدہ کرنے کا حتمی فیصلہ کیا تھا۔ ممکن ہے' اشفاق احمد نے خانوں والی خُو یہ فیصلہ کرتے ہی ختم کر ڈالی ہو اور منافقت کی راہ پر پہلا قدم رکھا ہو۔ یا پھر ان کی صوفیانہ حس نے انہیں بروقت باور کروا دیا ہو کہ بانو قدسیہ کو مسلمان کرنے کے بعد شادی کا عمل انہیں ''خان'' کے اعزاز سے محروم کرنے والا ہے۔ اشفاق احمد کے خاندان میں اصل پٹھان بچہ اُن کا بڑا بھائی افتخار احمد خان تھا' جسے لوگ پیار سے ''ڈیڈی'' کہتے تھے۔ اُس کا رعب داب اور اپنی بات پر قائم رہنا اُسے اصلی پٹھان ثابت کرتا تھا۔ اشفاق احمد کو بانو قدسیہ سے شادی (مسلمان کرنے کے بعد) کی اجازت اپنے والد صاحب سے انہی نے لے کر دی تھی۔ مزنگ کے پرانے رہنے والے جانتے ہیں کہ ٹرنر روڈ' مزنگ روڈ کو قطع کرتے ہوئے جب فرید

کورٹ ہاؤس کی طرف بڑھتی ہے تو وہاں کارنر والی تین چار مرلہ بلڈنگ (ایک مزنگ روڈ جواب وہاں ایک پلازے کی شکل میں موجود ہے) فیسرین کریم والوں کی ہوا کرتی تھی جس کے رہائشی اشفاق احمد کے بڑے بھائی المعروف ''ڈیڈی'' تھے۔ جو اشفاق احمد کو منافق کہتے اور سمجھتے تھے۔ اس بات کی تاریخی شہادت ہمیں معروف خاکہ نگار قمر یورش کی کتاب ''یادوں کے اُجالے'' میں صفحہ نمبر 115-114 پر ملتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ ہو: ''عاصم بٹ نے کہا: ''یوں سمجھو اگر اشفاق احمد پیتل ہے تو افتخار احمد پاسے کا سونا ہے۔'' ملاقات پر میں نے کہا: '' خان صاحب! آپ کے چھوٹے بھائی اشفاق احمد خان میرے واقف تھے وہ منافق ثابت ہوئے۔ میں اس سے ڈرتا ہوا نہیں ملا۔ آپ اس کے بڑے بھائی ہیں۔ کہیں آپ اس سے بڑے منافق نہ ہوں۔'' خان صاحب ایک دم جوش سے اُٹھے۔ میں گھبرا گیا۔ میں نے سمجھا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کی بھری محفل میں توہین کرنے پر مجھے گھونسہ مارنے لگے ہیں مگر انہوں نے کمال شفقت سے مجھے گلے لگا کر میری پیشانی کو چوم لیا اور کہنے لگے: ''بیٹا! تم نے اشفاق احمد کو منافق کہا ہے یہ بالکل ٹھیک کہا ہے۔ وہ واقعی منافق ہے۔''

اشفاق احمد اور بانو قدسیہ اپنی آشنائی گورنمنٹ کالج کے حوالے سے بتاتے ہیں لیکن اصل واقعہ یہ ہے کہ شناسائی میں اصل پیش رفت ''فیسرین کریم'' ہی کے دفتر میں ہوئی تھی۔ فیسرین کریم کے متعلق یوں سمجھ لیں کہ آج کل کی سٹلمینز کریم یا فیئر اینڈ لولی کریم تھی۔ بانو قدسیہ رنگ گورا کرنے کی غرض سے یہ کریم خریدنے فیسرین کے دفتر آئی تھیں۔ ڈیڈی کسی کام سے باہر گئے تھے اور اپنی جگہ چھوٹے بھائی اشفاق احمد کو بٹھا کر گئے تھے۔ اشفاق احمد نے اپنے فن داستان گوئی کا پورا پورا استعمال کم گو بانو قدسیہ پر کیا اور انہیں پٹانے میں کامیاب رہے۔ یوں اس محبت کی پنیری فیسرین کریم کے دفتر ہی میں لگی اور اس کی فصل گورنمنٹ کالج میں تیار ہوئی۔ یوں اشفاق احمد نے اپنے فن داستان گوئی کا پہلا اور دیرپا فائدہ بانو قدسیہ کی صورت میں حاصل کیا۔ شوکت تھانوی کی وفات کی صورت میں اشفاق احمد کو دوسرا موقع ملا کہ وہ اُن کے ریڈیو پروگرام ''قاضی

جی'' کی نقالی ''تلقین شاہ'' کی صورت میں کر سکیں۔ انہوں نے اس موقع کا بھی پورا پورا فائدہ اٹھایا اور تادم مرگ تلقین شاہ کا دامن نہ چھوڑا۔ اسی دوران ان کی آشنائی قدرت اللہ شہاب اور ممتاز مفتی سے ہوئی۔ ان دنوں وہ دیال سنگھ کالج میں لیکچرار ہوا کرتے تھے۔ قدرت اللہ شہاب نے انہیں ٹریننگ کے بہانے اٹلی اور امریکہ کی سیر کروا دی۔ واپس آ کر انہوں نے اپنی لیکچرر والی سیٹ ایسی ہی بے تکلفی سے سنبھالنی چاہی جیسے وہ کرسی سے اُٹھ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر لڈو پیٹھیاں والے کھانے گئے ہوں۔ کالج کے پرنسپل ان دنوں سید عابد علی عابد تھے جو اپنے زمانے کی ادبی لحاظ سے بہت بڑی شخصیت تھے۔ انہوں نے ضروری کارروائی کے بغیر اشفاق احمد کو کالج میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر اشفاق احمد نے اپنے سے بڑے افسانہ نگار رحمٰن مذنب کے پاؤں پکڑے اور بطور لیکچرر بحالی کے لیے آہ و زاری کی۔ بحالی کے کچھ عرصہ بعد ہی قدرت اللہ شہاب نے اشفاق احمد کو اعلیٰ مقام دلانے کے لیے مرکزی اُردو بورڈ کو نیا نام اُردو سائنس بورڈ (اشفاق احمد کی خواہش پر) دے کر وہاں کا ڈائریکٹر جنرل بنا دیا۔ کسی بھی آدمی کے حُسن و قبح کا پتہ اس کے صاحب اختیار ہونے کے بعد چلتا ہے۔ اشفاق احمد نے اردو سائنس بورڈ سنبھالتے ہی وہاں تاحیات رہنے کی منصوبہ بندی شروع کر دی۔ سائنسی اصطلاحات کو اُردو میں ڈھالنے کا لایعنی کام ''اُردو سائنس ڈکشنری'' کی صورت میں شروع کیا گیا۔ اس کام کے لیے سکالرز بھرتی کرنے کی بجائے میٹرک فیل مڈل پاس (ایک مثال: اسلم کولسری) ملازم بطور خاص بھرتی کیے گئے تاکہ وہ ایم۔ اے پاس ڈائریکٹر جنرل کے سامنے سر نہ اٹھا سکیں۔ ایسے لوگوں کی بھرتی کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ یہ لوگ ساری زندگی احسان کے بوجھ تلے دبے رہیں۔ رسول بخش بہرام کی صورت میں ایک جینئس اس ادارے کو ملا بھی لیکن وہ اس ادارے کو سوٹ نہیں کرتا تھا لہٰذا اُن کی خدمات علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی نے حاصل کر لیں۔ یہی وجہ تھی کہ اُردو سائنس بورڈ کے کچھ ملازمین کی نہ کئیں بہنیں اشفاق احمد کے گھر (داستان سرائے) میں اعزازی خدمات سرانجام دیتی تھیں۔ یوں اشفاق احمد

ایک ادبی وڈیرے کی صورت میں اُبھرا اور خوب پھلا پھولا۔ اختیارات کے نشے کا یہ عالم تھا کہ وہاں ملازم خاتون روبینہ نازلی گوندوی کو جنسی طور پر ہراساں کر کے نوکری چھوڑ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اُردو سائنس بورڈ کی پہلی منزل پر ڈائریکٹر جنرل (اشفاق احمد) صاحب ڈرامے لکھتے تھے جبکہ دوسری منزل پر ان کی بھولی بھالی اہلیہ بانو قدسیہ افسانے لکھتی تھیں۔ اُس زمانے میں ذاتی مہمانوں کی خاطر مدارات بھی یہیں ہوتی تھی اور جمعرات کی جمعرات لنگر بھی یہیں بانٹا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے سرکاری پیسے سے دیگیں تک خریدی گئی تھیں جو بعد میں کشور ناہید نے چارج سنبھالنے پر نیلام کروا دی تھیں۔ وہیں واصف علی واصف بھی آتے تھے اور اشفاق احمد اُن سے تصوف کی ٹیوشن پڑھ رہے تھے۔

ابوالفضل اور فیضی کی طرح اشفاق احمد کی یادداشت بھی بہت اچھی تھی۔ چنانچہ جو بات وہ کسی کے مونہہ سے ایک بار سنتے تھے' دوسری بار وہ لازماً اُن کی بات ہو جاتی تھی۔ لوگ اُن کے مونہہ سے عالمانہ اور فلسفیانہ باتیں سن کر حیران ہوتے تھے جن کا عمل سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ سب یادداشت کا کمال اور پیشکش کا انداز تھا۔ انہوں نے اپنی عمر کے ہر حصے کو میرٹ کے مطابق گزارا اور انجوائے کیا۔ وہ میرٹ کیا تھا؟ اُردو میں موقع پرستی پنجابی میں ''لگادا''۔ انہوں نے بچپن سے ایک مثال پلے باندھ رکھی تھی: ''گنگا گئے تو گنگا رام جمنا گئے تو جمنا داس'' پی ٹی وی پر ٹیلی کاسٹ ہونے والے پرانے (بلیک اینڈ وائٹ) گانوں میں آپ اکثر اشفاق احمد کو گانوں پر سر دھنتے ہوئے بھی دیکھ سکتے ہیں جنہیں دیکھ کر نئی نسل کو یقین دلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ وہی حضرت ہیں جو ''زاویہ'' جیسے پروگرام میں اخلاقی پند و نصائح کی ون وے ٹریفک جوش داستان گوئی میں چلاتے ہیں اور اُن کے سامنے بیٹھے حاضرین کا کام صرف سر ہلانا (تائید میں) ہوتا ہے' اُس کتے کی طرح جو کار کے پچھلے شیشے میں بطور ڈیکوریشن رکھا جاتا ہے اور گاڑی کی حرکت اُسے مسلسل حرکت میں لائے رکھتی ہے۔ اگر دِلّی کے آخری داستان گو میر باقر علی کو بھی اشفاق احمد کی طرح ٹی وی جیسا میڈیا میسر آ جاتا تو وہ بھی اپنی زندگی کے آخری

ایام میں ٹیلی ویژن سینٹر ریڈیو اور گورنمنٹ کالج (بھانجا زندہ باد) لاہور پھیری لگانے جیسی ''عظمت'' حاصل کرتے اور انہیں دِلّی کی گلیوں میں چھالیہ نہ بیچنی پڑتی۔ اشفاق احمد کو تو PICK & DROP کی سہولت بھی میسر تھی۔ اشفاق احمد کی خفیہ خدمات کا صلہ ٹی وی والوں نے یہ دیا تھا کہ ٹی وی کی O.B وین اُن کے گھر جا کر ''زاویہ'' ریکارڈ کیا کرتی تھی جبکہ گورنمنٹ کالج میں بھرتی ہونے والے پروفیسروں کی ریسرچ بھی اُن کے گھر بھجوائی جاتی تھی' رائے لینے کے لیے حالانکہ نہ تو وہ ڈاکٹر تھے اور نہ Ph.D سبجیکٹ سپیشلسٹ۔ اس طرح وہ بندر بانٹ کیا کرتے تھے۔ اُن کی آخری واردات میں بندر کا کردار ڈاکٹر سہیل احمد خان نے ادا کیا۔ ڈاکٹر نیّر صمدانی (گورنمنٹ کالج لاہور کے) پروفیسر کے لیے ایک اہل امیدوار تھے اور انہیں اکثریت (طالب علموں) کی حمایت بھی حاصل تھی لیکن ڈاکٹر خالد آفتاب اور اشفاق احمد کی ملی بھگت نے اُن کی طویل خدمات پر پانی پھیر دیا۔ ڈاکٹر خالد آفتاب کی جانبدارانہ ایمپائرنگ کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ آخر انہوں نے اپنے ''ٹیلینٹڈ'' ماموں سے کچھ تو سیکھا۔

''زاویہ'' ٹی وی والوں کی ضرورت نہیں' اشفاق احمد کی معاشی اور سماجی حاجت تھا لیکن ہمیشہ کنواں (پی ٹی وی) پیاسے (اشفاق احمد خان) کے پاس چل کر جاتا تھا۔ اشفاق احمد کو اس پروگرام کے نخرچے بھی ملتے تھے اور زبان کی رنگ بھی پوری ہوتی تھی۔ اتنی جگہ (پی ٹی وی' ریڈیو' گورنمنٹ کالج' امریکن سینٹر اور ایوان صدر) ہاتھ مارنے کے باوجود بھی اشفاق احمد کو جب کبھی پیسوں کی ضرورت پڑتی تھی' وہ اپنا کوئی بھی (اس میں تھکڑ یا معیاری کی کوئی تخصیص نہیں تھی) ڈراما' صرف ''ایک فون کال'' کی مدد سے دوبارہ' سہ بارہ (کتاب کے ایڈیشنوں کی طرح) ٹیلی کاسٹ کروا لیتے تھے۔ ریڈیو والے بھی ''اوپری ہدایات'' کے باعث اُن کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ وہی ریڈیو جہاں صداکار ڈیڑھ' ڈیڑھ سو کے چیک کیش کروانے کے لیے مارے مارے پھرتے ہیں' وہاں اشفاق احمد جیسے ریڈیائی جاگیردار کو ''تلقین شاہ'' کے سلسلے میں ایڈوانس ادائیگی کی جاتی تھی۔ دوسرے لفظوں میں اشفاق احمد کو میڈیائی جاگیردار بھی کہا جا سکتا ہے'

جنہوں نے اس قوم سے اپنی حیثیت سے کہیں بڑھ کر وصول کیا۔ اشفاق احمد وہ سودخور پٹھان تھا جس نے اپنا اصل زر (ٹیلینٹ) قومی اداروں (پی ٹی وی، ریڈیو اور اردو سائنس بورڈ) کی گردن پر انگوٹھا رکھ کر تا دم مرگ سود در سود وصول کیا اور کوئی رعایت نہ کی۔ انہوں نے پچی سوچ رکھنے والے لوگوں سے اپنے اس جملے: ''اس ملک کو اتنا نقصان جاہلوں نے نہیں پہنچایا جتنا پڑھے لکھوں نے پہنچایا'' کی بہت داد وصول کی اس بات کی وضاحت کئے بغیر کہ وہ خود اپنا شمار علماء میں کرتے ہیں یا جہلا میں؟ اشفاق احمد اور بانو قدسیہ کی مشترکہ تصنیف: ''راجہ گدھ'' میں یہ فلسفہ پیش کیا گیا تھا کہ حرام کھانے سے انسان کے جینز تبدیل ہو جاتے ہیں۔ کیا کسی صحافی یا ادیب کو یہ جرأت ہوئی کہ داستان سرائے کے مکینوں سے خون کا نمونہ جینز ٹیسٹ کی غرض سے ایک بار پھر طلب کر سکے۔

اشفاق احمد کی داستان گوئی خواص کے لیے اور تھی، عوام کے لیے اور۔ خواص کو وہ لمبے اقتدار کی دعائیں دیتے تھے۔ انہیں دم شدہ پانی اور دھاگے سے بھی نوازتے تھے۔ فون پر وٹامن A اور D سے بھرپور لطیفے بھی سناتے تھے۔ عمر کے آخری دنوں میں انعامی بانڈز کے نمبر بتانے جیسی سطح پر اتر آئے تھے جس کی اضافی آمدنی بھی اُن کے حصے میں آتی تھی۔ حکمرانوں کو وہ ''سب اچھا ہے'' کی کہانیاں سناتے تھے جبکہ عوام کو ''تلقین شاہ'' اور ''زاویہ'' کے ذریعے اُن راہوں کا راہی بنا دیتے تھے جن کی کوئی منزل ہی نہیں۔ جہاں تک میں سمجھ پایا ہوں اُن کا فلسفہ تھا: ''کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی''۔ اُن کے بعد اگر کوئی داستان کے ساتھ کسی حد تک جائز یا ناجائز تعلق کا دعویدار بن سکتا ہے تو وہ ذات مستنصر حسین تارڑ کی ہے۔ اُن کے نام کے ساتھ ''حاجی'' تو لگ ہی چکا ہے اب صرف داڑھی کی کسر ہے جو کبھی بھی پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن مستنصر حسین تارڑ داستان گوئی میں اشفاق احمد کی جگہ اس لیے نہیں لے سکتے کہ وہ اس سطح تک نہیں گر سکتے، جس سطح تک اشفاق احمد گر جاتے تھے، جس کی حد تو یہ کہ وہ اُردو سائنس بورڈ سے 22 سالہ اقتدار کے بعد زبردستی الگ (17 جون 1967ء تا یکم جولائی 1989ء، بے نظیر دور

میں) کیے جانے کے بعد نواز شریف کے برسر اقتدار آنے پر اپنے عہدے کی بحالی کے سلسلے میں (26 مارچ 1991ء تا 19 جون 1993ء) بطور سفارش طاہرہ سید کو نواز شریف کے پاس لے جانے کی حد تک مجبور پائے گئے تھے۔ جبکہ بانو قدسیہ قدرت اللہ شہاب کی چاپلوسی میں اس حد تک آ گے گئی تھیں کہ اُن کے پاؤں کے ناخن تک اپنے دست شفقت سے کاٹا کرتی تھیں۔ اسے خدمت کہیے یا چمچہ گیری' بات ایک ہی ہے۔ اشفاق احمد نے اپنے ٹی وی پروگرام ''زاویہ'' کی ریکارڈنگز بھی واصف علی واصف کی کتابوں ''گفتگو'' (جو ریکارڈنگز پر مشتمل ہیں) کی متاثر کن سیلز سے متاثر ہو کر کروائی تھیں۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ زاویہ پروگرام کے لیے سیٹ بھی ویسا ہی لگایا گیا تھا جیسا ماحول واصف علی واصف کی نشست (فردوس کالونی' گلشن راوی' لاہور) میں ہوا کرتا تھا۔ ایک نقال کو اوریجنل شخصیات کے مقابلے میں کہاں تک رکھا جا سکتا ہے؟ ری مکس گانے کو اوریجنل گانے کا مقام کیسے اور کیونکر دیا جا سکتا ہے؟ زمانہ کتنا ہی دو نمبر کیوں نہ ہو جائے' چائینہ کی چیزیں عوام کی کتنی ہی ضرورت کیوں نہ بن جائیں' اصل اور پائیدار چیز کی اہمیت بدستور برقرار رہے گی۔ ان تلخ حقائق کے جواب میں اشفاق احمد کے مداحوں کا جواب آنا منطقی سی بات ہے۔ میں ایسے ہر جواب کا کھلے دل سے خیر مقدم کرتا ہوں۔ بقول فیض:

غمِ جہاں ہو' غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے' آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں!

(اُردو کا آخری داستان گو۔ مرتبہ افتخار مجاز/عرفان احمد خان)

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

فیض اعوان

اشفاق احمد کے بعد

(اپنے عہد کی نامور شخصیات سے ملنے کا میرا شوق ہی تھا جو مجھے فیض احمد فیض تک لے گیا۔ وہ علیل تھے۔ مگر انہوں نے مجھے بلا لیا۔ یہ ۱۹۸۰ء کی دہائی کی بات ہے۔ فیض صاحب کے ساتھ تصویر، میری البم میں آج بھی موجود ہے۔ نوے کی دہائی کا آغاز ہوا تو میں اشفاق احمد سے ملنے جا پہنچا۔ "داستان سرائے" ۱۲۱۔سی، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔" یہ وہ دور ہے جب میں اپنے عہد کی نابغہ شخصیات سے مل رہا تھا ان سے باتیں اور سوالات کر رہا تھا۔ ایسے لوگ لاکھوں میں ہوتے ہیں۔ چنانچہ میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ کئی جگہ مجھے دشواریوں کا سامنا ہوا کہ در حقیقت نابغہ کون ہے۔ جب میں لاہور پہنچا تو میں نے اُردو ادب کے معروف افسانہ نگار انتظار حسین سے رہنمائی حاصل کرنے کا فیصلہ کیا اور ان سے ملا۔ انہوں نے کہا:" اگر یہ بات ہے تو کم از کم میری نظر میں اس وقت فصاحت اور بلاغت کا بہترین نمونہ ہی ہیں۔ آپ بس اشفاق سے مل لیجئے۔ میرے ان سے بعض فکری اختلافات اپنی جگہ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ وہ ہمارے عہد کے ایک بڑے آدمی ہیں۔")

اشفاق احمد اب ہم میں نہیں رہے۔ لیکن ان کی رحلت کے بعد متعدد ادباء نے اُن کے بارے میں لکھا ہے۔ اب تک تواتر کے ساتھ اُن کے بارے میں تحریریں آ رہی ہیں۔ انہی میں معروف شاعر اور اظہاریہ نویس جمیل الدین عالی بھی ہیں۔ میں عالی صاحب کے ساتھ ایک طویل نشست "بحیثیت انٹرویوز" کر چکا ہوں۔ اور وہ میرا ایک تفصیلی انٹرویو اشفاق احمد کے بارے میں مشاہدہ کر چکے ہیں۔ اشفاق احمد کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔ "میری یاد میں فیض صاحب کے سوا تخلیقی شخصیات میں اُردو اور انگریزی میڈیا اور عوام نے کسی اور کا ایسا سوگ نہیں منایا اور نہ صرف پاکستانی میڈیا بلکہ بھارتی میڈیا بھی لاتعداد پروگرام نشر کر چکا ہے۔ وہ (اشفاق احمد) میرے ایک آدھے یا پورے اظہاریے میں یا ایک دو کتابوں میں سما جانے والی شخصیت بھی نہیں ہیں۔ اُن کا پھیلاؤ کئی سمندروں سے بھی زیادہ ہے۔" کیا معلوم ہوا؟ یہ معلوم ہوا کہ اردو ادب میں فیض صاحب کے بعد اشفاق احمد سے بڑی اور نابغہ شخصیت نے جنم نہیں لیا حالانکہ اس دور میں کیا کیا لوگ پیدا ہوئے اور رخصت ہو گئے۔

ایک صحافی اور انٹرویور کی حیثیت سے راقم الحروف کو اب تک کم و بیش مختلف شعبہ جات کی دو سو شخصیات سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ یہ دو چار برس کا قصہ نہیں، ربع صدی کی بات ہے۔ ان میں ادب

سے متعلق کم وبیش تمام بڑی اور قابلِ ذکر شخصیات شامل ہیں لیکن اگر بعض بڑی یا قدرے کم بڑی شخصیات سے مَیں مل نہیں سکا تو بھی مجھے علم ہے کہ ان شخصیات سے صحافی اور ادیب طاہر مسعود مل چکے ہیں۔

یہ چند سال پہلے کی بات ہے، مَیں اور وہ کہیں جا رہے تھے۔ چلتے چلتے مَیں نے اُن سے پوچھا"طاہر مسعود! آپ نے متعدد نامور ادیبوں سے انٹرویوز کئے ہیں، مَیں بھی کر چکا ہوں۔ان ملاقاتوں میں ایک ذاتی تاثر بھی ہوتا ہے۔ یہ بتایئے جن قد آور شخصیات سے آپ کی ملاقاتیں ہوئیں، کس نے ذاتی طور پر سب سے زیادہ متاثر کیا؟ یوں کہ جی چاہا ایک بار پھر ملا جائے۔" یہ میرا سوال تھا انہوں نے ایک لمحہ سوچا، پھر کہنے لگے"فیاض اعوان! دو شخصیات ہیں اور انہی میں کانٹے کا مقابلہ ہے۔ایک اشفاق احمد اور دوسرے سلیم احمد۔ جب مَیں نے ایک دو اور ادیبوں کے ناموں کا ذکر کیا کہ کیا وہ نہیں ہیں؟ تو طاہر مسعود نے مسکراتے ہوئے کہا"جب کہیں مزاج پر گفتگو ہوگی۔تب ان پر بات ہوگی۔"

اب یہ وہ لوگ ہیں (انتظار حسین، عالی صاحب اور طاہر مسعود جنہوں نے اپنی اپنی زندگی میں سینکڑوں لوگوں کو پڑھا اور جانا۔مگر ان میں ہر ایک نے اشفاق احمد کو"دی گریٹ" مانا۔ (یہی تبصرہ معاصر"ڈان" نے دیا ہے) لیکن بہر حال یہ وہ حضرات ہیں جو کم یا زیادہ اشفاق احمد کے حلقۂ اربابِ ذوق میں شامل ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔اس سے بڑی بات یہ ہے کہ اشفاق احمد کو اب ادیب، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار اور فنِ گفتگو کے امام کی حیثیت سے اُن سیکولر ادیبوں اور شاعروں نے بھی تسلیم کر لیا ہے جو زندگی بھر ان کے محاسن کی تنقید کرتے رہے۔انہیں پرانی وضع قطع کا دقیانوسی لکھاری اور مولوی کہتے رہے۔صورت حال اس قدر تبدیل ہو چکی ہے کہ ان سیکولر ادیب حضرات کو بھی اشفاق احمد کے بعد کوئی دوسرا دکھائی نہیں دے رہا۔اور یہ بات مَیں یونہی نہیں کہہ رہا ہوں، مجھے اچھی طرح علم ہے۔یہی وہ بات ہے(''اشفاق احمد دی گریٹ'') جو ان سب نے مشترکہ طور پر بچی کہی ہے۔حالانکہ وہ یہ چاہتے ضرور ہیں کہ کوئی''اپنا''اشفاق احمد ثانی، کہیں سے برآمد کر لیں مگر وہ کر نہیں سکیں گے۔ یہی بات یہ ہے اگر یہ ممکن ہوتا تو جمیل الدین عالی ایسے روشن اور وسیع المطالعہ ادیب یہ ہرگز نہ لکھتے کہ''اکثر دنیائے ادب و دانش میں بڑی شخصیات کی موجودگی میں ہی، انہی کے مقلدانہ...... افسوس مَیں یا میری کم نظری کہ مَیں اشفاق احمد ایسی کوئی شخصیت اُبھرتے ہوئے نہیں دیکھتا ہوں حالانکہ بانو قدسیہ اُن کی جانشین ضرور ہیں مگر مَیں مستقبل بعید کی بات کر رہا ہوں۔کیا معلوم ہوا؟ یہ معلوم ہوا کہ اشفاق احمد کے بعد نہ صرف یہ کہ''آج'' دوسرا اشفاق احمد موجود نہیں ہے بلکہ مستقبل بعید تک آثار مفقود دکھائی دیتے ہیں حالانکہ بلاشبہ بڑے افسانہ نگار، بعض ڈرامہ نگار اور بعض ناول نگار موجود ہیں لیکن وہ جسے ہم ہمہ صفت ہمہ پیکر کہتے ہیں اور اشفاق احمد کہتے ہیں ناپید ہیں۔ بہت دُور دُور تک کہیں کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ آپ مجھ سے پوچھیں تو مجھے اُن کے نصف کے نصف بھی نہیں ملتے۔

تو یہ تو ایک سانحہ ہے ہی لیکن اس سے اُوپر ایک اور بڑا سانحہ اُن لوگوں پر گزر رہا ہے جو مذہب، انسانیت، فلسفہ محبت یا سائنس کے حوالے سے انتہائی نوعیت کے اہم اور فکری سوالات کیا کرتے ہیں۔ ایسے سوالات جو دلوں، ذہنوں، اُن کی روحوں اور پورے وجود سے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ اشفاق احمد وہ تنہا مفتی، تنہا ادیب اور تنہا مفکر تھے، جو سب کے سب سوالات کے جوابات دیا کرتے تھے۔ اس طرح آج یہ ایک انتہائی مسئلہ پیدا ہو چکا ہے کہ اشفاق احمد کے بعد، ان لوگوں کے سوالات کے جوابات کون دے گا؟ کوئی ہے تو بتائیں اور یہ وہ سوال ہے جس کی اہمیت اور حدت کا انداز صرف اہلِ فکر ہی کر سکتے ہیں۔

ہزار برس سے اوپر کی بات۔ اپنے دور کے بزرگ کامل۔ تابعی اور فنِ تعبیر کے امام "اُستاد محمد بن سیرین" سے ایک عورت نے خواب کی تعبیر پوچھی۔ بہت سے لوگ وہاں موجود تھے۔ خواب سنتے ہی حضرت کا رنگ متغیر ہو گیا اور فرمایا۔ "اپنا خواب دوبارہ ذکر کرو" اُس نے پھر پہلے ہی کی طرح بیان کیا۔ یہ سنتے ہی آپ نے پیٹ پکڑ لیا اور فرمایا۔ "اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ عنقریب اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم، اس جہانِ فانی سے گزر جائیں گے۔" اور پھر لوگوں نے دیکھا کہ ساتویں روز خود حضرت محمد بن سیرین وفات پا گئے۔ یہ بلائے ناگہانی پڑی تو لوگ بے ساختہ پکار اُٹھے۔ "موت العالم ..... موت العالم موت العالم" یعنی یہ صرف ایک عالم کا انتقال نہیں ہوا بلکہ کل عالم کا انتقال ہو چکا ہے۔" سچ پوچھئے تو ہزار برس بعد اشفاق احمد کا انتقال بھی ایک ادیب، ایک ڈرامہ نگار، ایک صوفی یا ایک عالم کا انتقال نہیں ہے بلکہ یہ ایک عالم کا انتقال ہے۔ موت العالم..... موت العالم ..... !"

مشہور ہے ہر صدی میں ایک ولی اللہ کا نزول ہوا کرتا ہے (اور اُس کا ذکر صدیوں تک چلتا رہتا ہے) جب اللہ تعالیٰ اپنا ولی پیدا کرتا ہے تو وہ اپنے سے پہلے والے ولی اللہ کی باتیں بتاتا ہے۔ اس کے علم و ہنر کو بیان کرتا ہے۔ اس کا ناک نقشہ بیان کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے ولایت کی کسی شاخ نے اشفاق احمد کو چھو لیا اور وہ اس صدی کے اپنی طرح کے ولی تھے اور اب کوئی سو برس بعد دوسرا اشفاق احمد آئے گا۔ آنے والا ولی اللہ، اپنے سے پہلے اشفاق احمد کے بارے میں بیان کرے گا اور کہا کرے گا کہ "اس اشفاق احمد کی بھی میری طرح داڑھی ہوا کرتی تھی۔ بلاشبہ اس عہد کے وہ لوگ خوش نصیب ہوں گے جو اس بابا جی کو براہ راست دیکھیں گے اور سنیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ہم اپنے عہد کے خوش نصیب لوگ ہیں کہ ہم نے اپنے عہد کے اشفاق احمد کو دیکھا ہے، سنا ہے اور جانا ہے ..... اور پھر میں تو مزید ان چند خوش نصیبوں میں سے ایک ہوں جسے اشفاق احمد نے ایک چٹ لکھ کر دی ہے اور دستخط کئے ہیں میرا بھی کیا کہنا! میں بحیثیت صحافی اُن سے تین ملاقاتیں، تین انٹرویوز کر چکا ہوں۔ نہایت اہم اور تفصیلی نوعیت کے انٹرویوز ..... جن میں سے ہر ایک کی آڈیو کیسٹ میری لائبریری میں موجود ہے۔ خوش قسمتی اور کیا ہوتی ہے؟؟؟

(سہ ماہی فنون لاہور، جنوری۔ اپریل ۲۰۰۵ء)

یونس جاوید

شجر سایہ دار

کیسا مسرور کن دن تھا کہ میں اشفاق احمد جیسے لکھاری کے لئے اپنی نئی کتاب "میں ایک زندہ عورت ہوں" لے کر جا رہا تھا۔ گزشتہ تین دنوں سے اظہر جاوید کے ساتھ جانے کا پروگرام بن رہا تھا۔ اجازت کے لئے فون کرنے کی کوششوں میں ہی تین دن گزر گئے تھے۔ تب آج ہم نے سوچا تھا کہ بغیر اجازت اظہر اور میں جا دھمکیں گے۔ ملاقات ہو گی، ان کی گفتگو سے اپنے باطن میں چاند رتبہ بنائیں گے اور جلا پائیں گے۔ مجھے تو یہ زعم بھی تھا کہ اپنی کتاب پہ شاباش بھی ملے گی۔ اس لئے نہیں کہ یہ کتاب بانو آپا اور اشفاق احمد کے نام معنون تھی بلکہ اس لئے کہ کہانیوں کی ہر اچھی کتاب پہ وہ خوش ہوتے تھے۔ انہیں ڈیڈیکیشن کی خبر نہیں دی گئی تھی بلکہ سبھی سے چھپایا گیا تھا کہ کتاب کس کے نام ڈیڈیکیٹ ہے۔ میں نے اس کے لئے برسوں انتظار کیا تھا کہ میری کہانیوں کی کوئی کتاب اس قابل ہو کہ اسے ان دو معجزاتی لکھاریوں کے نام کر سکوں۔ سوچا تھا اچانک دیکھیں گے تو شاید مسرت محسوس کریں اور ان کی مسرت میرے اور کتاب کے لئے اعزاز تھی مگر اسی دن فون کی کیسی قیامت گھنٹی تھی کہ اس کے ساتھ اشفاق صاحب کے بچھڑ جانے کی خبر لپٹی تھی۔ گویا اپنے آدھا مر جانے کی اطلاع۔ پہلے اندر باہر سناٹا تن گیا پھر دن بھر اپنا ہی ماتم ہوا۔ موت کی ضد کے سامنے، زندگی کی دم توڑتی ہارتی ہوئی دلیل، پھر اگلے دن، ان سے محبت کرنے والوں کے رواں سمندر، اور میں اس میں جذب ہو جانے والا قطرہ سا۔

یہ بات باباجی (محمد یحییٰ خان) جانتے ہیں کہ کچھ دن بعد میں اپنی کتاب ان کی قبر پر رکھ آیا تھا۔ تادمِ تحریر۔ بانو آپا کے پاس حاضر نہ ہو سکا، نہ کتاب پیش کرنے کی جسارت کی۔ یہ کیسی تعزیت تھی جس کے لئے کوئی لفظ میری دسترس میں تھا ہی نہیں۔ عمر، لفظوں کے شناوروں کے درمیان کاٹنے کے باوجود...... اب تک نہیں ہے۔

اشفاق صاحب (جنہیں میں ہمیشہ آغا جی کہا کرتا تھا) کی بہت سی تصویریں میرے آس پاس اڑتی پھرتی بکھر رہی ہیں، متحرک، سٹیچرز کی طرح۔

پہلی تصویر میں میں نے اپنے والد کی دکان "اے حمید اینڈ سنز سٹیشنرز" کے کاؤنٹر پر بیٹھے دیکھی تھی۔ "کاشانہ ادب" جو ہماری دکان کے ساتھ جڑا تھا، کے بالکل سامنے ریلی سائیکل کا سہارا لئے ایک وجیہہ شخص، جو مختلف رسائل کی ورق گردانی کر رہا تھا، وہ ہر رسالے کو اٹھاتا، دیکھتا پھر رکھ دیتا۔ مسجد مکتب سے آکر چونکہ مجھے تھوڑی دیر کے لئے دکان پر ہی پڑاؤ کرنا ہوتا تھا لہٰذا ہر دوسرے تیسرے دن یہی منظر دیکھنے کو ملتا۔ ایک روز اشفاق صاحب کے جانے کے بعد کاشانہ ادب والے مولوی صاحب نے مجھ سے پوچھا "تم انہیں جانتے ہو؟"

میرے نفی میں سر ہلانے پر بولے "یہ بہت بڑا ادیب ہے، پروفیسر بھی ہے اور وہ "فیسرین کریم" ہے نا۔۔۔ وہ بھی ان کے والد صاحب نے بنائی ہے۔"

فیسرین کریم سے میں چونک گیا کہ وہ ہمارے گھر میں باقاعدگی سے آتی تھی ایک شیشی [illegible] سپیشل۔ گویا "آپ بھی جالندھر کے ہیں" والا تعارف مکمل تھا۔ ان کی فیسرین سے دوستی مجھے بہت اچھی لگی اور میں نے ان کی پروفیسری، ادب اور وجاہت کو اسی کریم کے پلڑے میں ڈال دیا اور رات کو اپنی بہن کو قسم کھا کر بتایا بھی کہ یہ کریم تو آدمی کو حسین ترین بنا دیتی ہے۔ میں نے اس کریم کا زندہ کرشمہ آج ہی دیکھا ہے۔ دوسرے منظر میں کچھ سال بعد میرزا ادیب سے ادب لطیف کے دفتر میں ملاقات کیا ہوئی کہ میرزا روزانہ کا معمول، وہاں جانا، ادیبوں کو دیکھنا اور حیرت سے [illegible] ٹھہر گیا۔ اندر کچھ غبار سا تھا جسے راستہ نہ مل رہا تھا۔ ہر چند کہ مسجد مکتب میں لفظ جوڑ جوڑ کر ایک ناول لکھ چکا تھا اور ایک کہانیاں بھی لکھیں اور ان کی اشاعت پہ حیرت میں ڈوبتا ابھرتا رہا۔

"میرزا ادیب" کی کتاب "صحرا نورد کے خطوط" نے مجھے ہی نہیں بہت سوں کو گرمایا تھا اور مجھے تو اس نے کچھ زیادہ ہی مضطرب کر رکھا تھا۔ مگر دو چار کہانیاں ادھر ادھر چھپنے اور روزانہ میرزا ادیب کے دفتر میں حاضری کے باوجود میرزا ادیب نے گھاس نہ ڈالی تھی۔ (تفصیل میرزا ادیب کے [illegible] میں لکھ چکا ہوں) اس بات کا رنج بھی تھا بے چینی بھی بلکہ غصے کا سائبان اندر ہی اندر پھیل چکا تھا۔

ان دنوں دو رسالے ایسے تھے جنہیں دیکھ کر میں اکسائٹڈ ہو جاتا۔ ایک "لیل و نہار" دوسرا "داستان گو"۔ دونوں وضع قطع اور انتخاب کے معیار کے حوالے سے منفرد تھے۔ مگر داستان گو یکتا تھا کہ کہانیوں کے لئے مخصوص تھا۔

ادب لطیف کے دفتر میں ہی معلوم ہوا کہ داستان گو اشفاق احمد اور بانو قدسیہ مل کر شائع ہی نہیں کرتے۔ آفسٹ مشین پر چھاپتے بھی ہیں۔ سب لوگ تو اس بات کے معترف تھے ہی، میرے دل میں بھی ان کی ادب سے لگن اور اشاعت نے سورج سا طلوع کر دیا تھا۔ ان رسائل میں شائع ہونا ایک خواب تھا میرے لئے ...... کہ اچانک مجھے پتہ چلا کہ اشفاق احمد داستان گو کے ساتھ لیل و نہار کے بھی ایڈیٹر ہیں۔

خواب بُنتے اور حیران آنکھ سے جاگتے، سوچ بچار کرتے ایک کہانی ہو گئی۔ "برش اور تلوار" پھر "کنارے کنارے" لکھی۔ "برش اور تلوار" لیل و نہار کو بھجوا دی اور "کنارے کنارے" داستان گو کو۔ پھر اندر کے خوف اور خفت سے گھبرا کر حفظ ماتقدم کے لئے جو خط "داستان گو" کو لکھا۔ وہ مشتعل کر دینے والا اور اشفاق احمد کے کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہونے کی کوشش کی طرح کا تھا۔ میرزا ادیب کے گھاس نہ ڈالنے کے غصے کا غبار شاید اسی خط میں پھیل گیا تھا کہ "جناب اگر میں نے بانو قدسیہ کے افسانے نہیں پڑھے یا آپ کی کتاب "ایک محبت سو افسانے" کی تعریف میں آپ کو خط نہیں لکھا تو اس لئے اس کہانی کو مسترد نہ کیجئے گا۔ یقیناً آپ کے ہاں معیار کا ترازو تو ہو گا اس میں کہانی رکھئے اور پھر..... وغیرہ وغیرہ۔ سامنے کی بات ہے کہ کہانی مسترد ہونے کی خفت کے لئے پیشگی ڈھارس کی دیوار کھڑی کر دی تھی میں نے۔ مگر وہ کیا خوبصورت دن تھا جب مجھے "داستان گو" کے سائز سے ذرا چھوٹا پوسٹ کارڈ ملا۔ اشفاق احمد کے دستخطوں سے لکھا ہوا خط۔

کہ محبت سے انہوں نے مجھے سمجھایا تھا...... متوازن...... متناسب اور پیار بھرے جملوں کا منظر نامہ۔ آخری جملہ کچھ اس طرح کا تھا کہ "دوسرے لکھنے والوں کے لئے تعصبات ضرور رکھئے مگر لگام بھی ہاتھ میں رہنی چاہئے ...... آپ کی کہانی اس قابل ہے کہ داستان گو میں شائع ہو ......" پور پور رنگ سے بھر گئی مگر خوشی سے باچھیں اس دن کھلیں جب دونوں کہانیاں شائع ہو گئیں۔ دونوں رسائل ہاتھ میں آئے تو میں نے زمین پر قدم جما کر چلنے کا اعتماد پہلی مرتبہ حاصل کیا۔ فخر سے رسائل بہت سوں کو دکھائے۔ حتیٰ کہ میرزا ادیب کو بھی۔ میرزا نے رسائل کو سرسری دیکھا اور میز پر رکھ دیئے۔ یہ نہیں کہ کہ "ادب لطیف کے لئے لکھو" میں جل بھن کر رہ گیا البتہ پنجاب بک ڈپو (ادب لطیف کا دفتر) میں بیٹھنے کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ جب کچھ دن بعد اشفاق صاحب کے دفتر میں میری کہانیوں کے حوالے سے بات اور میری تلاش شروع ہوئی تو ظفر صاحب (محترمہ صدیقہ بیگم کے بھائی) نے فوراً بتایا کہ یونس جاوید تو تمام دن ادب لطیف کے دفتر میں ہوتا ہے۔ تب ان کی ڈیوٹی لگ گئی کہ وہ مجھے تلاش کر کے لائے۔

[illegible] ظفر نے جب مجھے یہ بتایا کہ "اشفاق احمد صاحب نے تمہیں بلایا ہے" تو یقین نہ آنے کے باوجود کلیجہ دھک سے رہ گیا اور یقین آ جانے پر تو سر سے پاؤں تک گویا ہلچل مچ گئی...... اندر سے خوشی اور باہر سے کانپا، دونوں چھنٹ گئے تھے۔ کبھی ایسا تجربہ تھا ہی نہیں اور کچھ رہ رہ کر وہ خط یاد آ جاتا جو اس وقت مجسم ندامت بن رہا تھا۔ کانوں کی لویں سرخ ہو رہی تھیں اور وجود پسینے میں بھیگ رہا تھا۔ ظفر نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ مجھے جو جھجک، خوف اور ہراس محسوس ہو رہا تھا۔ ظفر اس سے ذرا بھر واقف نہ تھا وہ بار بار کہہ رہا تھا اشفاق صاحب بڑے میٹھے آدمی ہیں، بے خطر چلو۔

اشفاق صاحب کا گھر آ گیا... اندر بلا لئے گئے، وہی وجیہہ آدمی ملا۔

میں نگاہیں جھکائے بیٹھا رہا... اشفاق صاحب جانے کیا کیا کہتے رہے۔ بے ساختہ...... بے تکلف... ہمدرد اور شگفتہ... مگر مجھے کچھ سنائی ہی نہ دے رہا تھا۔ آخر میں صرف ایک بات سنائی دے گئی کہ۔ تمہارے اندر چنگاری موجود ہے، محنت کرتے رہنا... سپر نہ ڈالنا... تم لکھ لیتے ہو...... وغیرہ۔

واپسی پر ظفر میری تعریف کرتے ہوئے بولا "دیکھا... اتنے بڑے ادیب نے بتایا ہے کہ تمہارے اندر "سپارک" ہے... برادر... اب ڈٹ کر لکھوں"۔

یہ اشفاق صاحب کی دین ہی تو تھی کہ "لکھ لینے" کا اعتماد میرے اندر آ اترا تھا۔ آج میں جو کچھ بھی ہوں اس "چنگاری" کا کھوج لگانے والے اور اسے ہوا دینے اور حالات کے سامنے سپر نہ ڈالنے کا درس دینے والے اشفاق احمد کی بدولت ہوں۔ یہ ایسی بات نہیں ہے جو میں پہلی مرتبہ کر رہا ہوں۔ "ہالی ڈے ان" میں ایک شاعرہ کے مجموعے کی رونمائی کے موقع پر میں نے یہ اعتراف برملا کیا تھا اور انہی کی صدارت میں کیا تھا اور یہ بھی کہا تھا کہ ہر چند آج ایسے ادیب بھی موجود ہیں جو اپنے گروہی تعصبات کی حرارت میں ہر لمحہ خود کو تپائے رکھتے ہیں اور اپنی ذات سے دو گز پرے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کی ساری کاوشیں بھی اپنے ہی گروہ تک محدود رہتی ہیں۔ زندگی بھر لکھاری نہ بن سکنے والوں کو سرٹیفکیٹ دیتے اور انعام دلواتے ہیں مگر جینوئن لکھاری چونکہ اپنے لفظ کی طاقت سے سانس لیتا ہے، لہٰذا ان کی خواہش اور کوشش یہی ہوتی ہے کہ نابود ہو جائے۔ یہ بات میں نے ریڈیو کے مشاعرے میں ریکارڈنگ انجینئر کے کیبن سے مشاہدہ کی کہ اقبال ساجد (مرحوم) جیسے مضبوط شاعر کو سر کی جنبش سے داد دی جا رہی ہے کہ صوتیات کے عمل میں داد سامعین تک نہ پہنچے...... اور شاعر بھی خوش رہے۔

نکتہ نمبر 1 اشفاق احمد جیسا جادوگر دانشور...... اپنی دانش و بینش اور داد صوفیا کی طرح لٹا دیتا تھا۔

اُس کا کوئی گروہ تھا نہ قبیلہ۔ وہ ہر اُس شخص کے قبیلے سے تھا جو الفاظ کی تہذیب اور خیال کی بنت کا ہنر جانتا تھا جس کے پاس متخیلہ اور کہنے کو کچھ تھا، جو لکھ سکتا تھا، پتہ نہیں، مجھے ایسے کتنوں کو اس بہتے دریا نے اپنی بینش اور داد سے لبالب کر دیا ہو۔ انہی دنوں جب مجھے "لکھ لینے" کا اعتماد ملا تھا، ایک گرم سہ پہر کو میں ٹی ہاؤس کے ہجوم میں اکیلا تھا۔ قائداعظم کی تصویر کے نیچے اکیلا سوچ رہا تھا، کوئی دوسرا لکھاری آ جائے تو ہلچل مچے۔ دعا تھی یا خواہش، قبول ہوئی مگر ایسی ویسی، دروازہ کھلا اور خلاف توقع اشفاق احمد داخل ہوئے۔ انہوں نے ایک نظر میں اندازہ کر لیا تھا کہ کھانے پینے اور شور مچانے والوں میں کوئی مبتدی ادیب بھی موجود نہیں ہے وہ سیدھا میرے پاس آئے۔ میں استقبال کو اٹھا تو وہ جلدی سے بیٹھ گئے بلکہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کو کہا۔ پھر بتایا کہ کسی کام سے ادھر آیا تھا سوچا اندر بھی جھانک لوں۔ میں اس قدر اکسائٹڈ ہو رہا تھا کہ مجھے ان کی بات سمجھ آ رہی تھی نہ کہنے کو کچھ سوجھ رہا تھا۔ اشفاق صاحب نے میری کیفیت بھانپ لی۔

زیادہ بے تکلیف ہو کر کہا "کیا لکھ رہے ہو؟" میں کیا جواب دیتا..... خود ہی کہنے لگے "ایک صفحہ لکھنا ہو تو سو صفحہ پڑھنا چاہئے، یہ کھاد ہے۔"

"جی!"

"گھبراؤ نہیں بھائی تم میرے قبیلے سے ہو...... دوست بھی۔"

"دوست؟" میرے اندر چیخ جیسی لکیر کھینچ کر رہ گئی اور آواز اندر ہی گھٹ گئی۔ اس جملے کے بوجھ سے میں دب سا گیا تھا، آنکھیں خوشی سے بھیگنا چاہتی تھیں کہ انہوں نے کہا:

"ہاں دوست! دیکھو زندگی بھر میں نے اپنی عمر سے بڑوں سے دوستی کی ہے یا سمجھو ہو گئی دوستی" لمحہ بھر رک کر بولے "مفتی مجھ سے بڑا ہے، شہاب بڑا ہے.... ابن انشاء اور عالی برابر ہی سمجھو .... مگر زیادہ تر بڑوں سے دوستی رہی ہے۔" (انہوں نے چند نام اور بھی لئے تھے جو میرے حافظے میں نہیں ہیں) "تم کہو گے میرے اندر جا اِلی سے بڑا ہونے یا بڑا بن جانے کی خواہش یا جنون تھا... ہاں شاید مگر" انہوں نے بات بدل کر کہا: "ہم تھے تو ہم عصر ہم قلم ہی نا جیسے تم میرے ہم عصر ہو......"

میں مسکراتا رہا اور دل میں یہ دعا بھی کرتا رہا کہ تھوڑی دیر پہلے جو میں کسی دوست کی تمنا کر رہا تھا، اب نہ آئے اور کوئی دوسرا قلمکار تو بالکل ٹی ہاؤس نہ آئے اور اشفاق احمد کی خوبصورت گفتگو کا انعام مجھ سے چھین نہ لے اور یہی ہوا بھی... کوئی دوسرا نہ آیا اور میں ان کی گفتگو ہمہ تن گوش ہو کر سنتا رہا۔ اشفاق احمد کی محبت نے میرے اندر کئی چراغ جلائے ... جن کی روشنی نے اندر ایسا ڈیرا جمایا

کہ روشنی ہر روز ہر لحہ بڑھتی رہی ... کم نہ ہوئی......ان کی یہ محبت ہر کسی کے لئے تھی مگر یہ سوچ کر کہ میرے لئے بھی ہے ... میں زندہ ہونے لگتا تھا۔ وہ تو عید بقر عید پہ راہ چلتے کانسٹیبل کو گلے لگا کر مبارکباد بھی دے دیتے تھے کہ کانسٹیبل محبت اور پذیرائی کے بوجھ سے روہانسا ہو جاتا اور اچانک عزت افزائی پر پریشان اور جب اسے معلوم ہوتا کہ اسے گلے لگا کر مبارک دینے والا "تلقین شاہ" تھا تو اس کا سینہ چالیس انچ سے پھیل کر بیالیس انچ ہو جاتا۔

میں اس کے بعد ہی داستان گو کے دفتر میں جانے لگا تھا جو ریگل مال کی ایک گیلری میں تھا۔ اشفاق صاحب سے کبھی کبھار ہی ملاقات ہوتی تھی مگر اس دن ملاقات بھی ہو گئی اور گورمکھی میں چھپا ہوا ایک رسالہ بھی انہوں نے مجھے دیا اور کہا "تمہاری کہانی "دس نمبری" کا ترجمہ چھپا ہے جو داستان گو میں شائع ہوئی تھی۔ "میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رسالے کے اس صفحے کو دیکھتا رہا جو "دس نمبری" کے آغاز پر بنایا گیا تھا۔ کہانی کا ایک لفظ تک نہ پڑھ سکا۔ حتیٰ کہ اپنا نام بھی۔ مگر اشفاق صاحب گورمکھی اور ہندی سے شناسا تھے۔ اس طرح کی خبر سناتے ہوئے انہیں خود مسرت ہو رہی تھی۔ وجہ داستان گو کا معیار تھا جس کی ہر تحریر کسی نہ کسی زبان میں ترجمہ ہو جاتی تھی۔

کتنے برس گزر گئے۔ یہ تعلق کم نہ ہوا۔ دفتر میں اچانک ان کا فون آتا وہ جلالی سے کہتے: "بہت فون کئے ... تم ملتے ہی نہیں ہو ... تمہاری آپا نے بلایا ہے ... شام کو پانچ بجے ... آنا ضرور ......"

"ضرور سر" میں فخر سے جواب دیتا تو وہ کہتے "بڑی مہربانی" وہ فون بند کر دیتے تو میں خود سے کہتا "مہربانی تو آپ ہیں اشفاق صاحب، بلکہ بانو آپا بھی ...... کہ جو اتنی عزت دیتے ہیں ......"

انہی باتوں سے میرے دل میں ان کے لئے محبت کی لہریں اٹھتی چلی جاتیں۔ یہ کیسی محبت تھی جس میں احترام ہی احترام تھا۔ ان کی بات کو عبادت کی سی یکسوئی سے سننے کے مراحل تھے۔ شاید اسی لئے ادھر سے ہمیشہ کی پھوار سننے والے کو بھگوتے چلی جاتی تھی۔

ایسی شگفتہ گوئی کم ہی سننے کو ملی جو دل میں اترتی چلی جائے، اثر کرتی چلی جائے۔ شاید یہی جادوگری ہے جو اشفاق احمد کے پاس تھی۔ یہ جادو ان کے بے پناہ علم نے ان کے اندر جگا رکھا تھا کہ ان کا مطالعہ سمندروں کی طرح وسیع اور گہرا تھا۔ متخیلہ ایسا کہ حافظے میں جزئیات اپنی جزئیات سمیت محفوظ رہتیں۔ گھنٹوں تک زبانی بول دیتے۔ کوئی بات شروع کرتے تو بات، نئی سے نئی صورتحال کو اپنے کمال جمال سے کھولتی چلی جاتی ... بالکل الہام جیسی کیفیت میں۔

ایک روز کوئی تقریب تھی یا بلاوا ... میں سب سے پہلے "داستان سرائے" پہنچ گیا۔ اشفاق صاحب اور میں ہی تھے ...... باتیں شروع ہوئیں تو انسانی انا، تکبر، غرور اور رعونت تک پھیلتی چلی

گئیں اور وہاں سے دوستی، محبت اور وفا تک پہنچیں۔ دوستی اور وفا کے حوالے سے درمیان میں جانوروں کا ذکر بھی آیا۔ انہوں نے گھوڑے کو انسان کا بہترین دوست قرار دیا اور وفا اور دوستی میں یکتا کہا۔

میرا سوال تھا کہ وفا، دوستی محبت میں کتا بھی تو ہے اسے ہم ناپاک اور نجس قرار، گھوڑے کو شدید ضرورت کے تحت حلال بھی۔

اشفاق صاحب نے ایک لمحے سے بھی کم وقت تک آنکھوں کو گھمایا اور کہا گھوڑے میں ... ساتھ انا بھی ہے وہ مالک کی غلط حرکت سے ناراض بھی ہو جاتا ہے اور اسے غلطی کا احساس دلاتا ہے جبکہ کتے کو ٹھوکریں مارو، سو مرتبہ در سے اٹھا دو وہ پاؤں پہ ہی سوتا ہے۔ دہلیز چھوڑتا ہے نہ ساتھ، نہ ہی در کو بھولتا ہے، اسی لئے نجس ہے۔

"یہ بات تو اس کے کریڈٹ میں ہونی چاہئے کہ ......"

انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روکا اور اپنی بات مکمل کرنے کے لئے بولے ...... "وہ اپنی ذات کی نفی کر کے بندے کی انا کو رعونت کی حد تک پہنچا دیتا ہے، اسی سبب سے نجس کہلاتا ہے کہ رعونت اور غرور خدا کو سخت ناپسند ہے"

شاید اسی دن میں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ سال چھ ماہ بعد لاہور کے لکھاریوں کا اکٹھ ہو اور آپ سے سوالات کئے جائیں اور جواب میں آپ کا لیکچر سنا جائے تو کیسا رہے؟ انہوں نے اس بات کو پسند کیا تھا مگر ہمارے لکھاریوں میں ہر ایک کو انا اور اس کا مفہوم مجھی تو علیحدہ ہے لہٰذا یہ بیل تو منڈھے نہ چڑھ سکی مگر ٹی وی پر "زاویہ" جیسا پروگرام ضرور ہو گیا۔ ایک پروگرام میں میں بھی تھا اور ہر چند کہ ان کی خواہش تھی کہ سوالات بھی ہوں مگر ٹی وی والوں کا اپنا ایک طریق کار ہے، لہٰذا سوالات کا خانہ گول ہی کر دیا گیا مگر "زاویہ" آج بھی لوگوں کے دلوں کو حرارت اور آنکھوں میں روشنی بکھیر رہا ہے۔ مجھے وہ دن بھی یاد آ رہا ہے جب انہوں نے ایف سی کالج کی ادبی تقریب کے بعد ہم سب کو اپنے نئے "بابے" سے ملوانے کی دعوت دی تھی۔ عطاء الحق قاسمی سب کو چلنے کے لئے حرارت دے رہا تھا شاید اس لئے کہ بابے سے ملاقات ایم اے او کالج میں رکھی گئی تھی جہاں عطاء پروفیسر تھا۔ سب جوش و خروش سے پہنچے مگر مجھے باباجی کو دیکھ کر حیرت ہوئی۔ اس لئے کہ وہ اپنے دیکھے بھالے واصف علی واصف تھے۔ میں اور محمد سلیم طاہر بہت پہلے ان سے بے تکلف تھے اور تانگہ روڈ پر ان کے انگلش کالج میں جایا کرتے تھے۔ ان سے غزلیں سنتے تھے اور گپ شپ رہتی تھی۔ اس کے بعد دو کئی مرتبہ ٹی ہاؤس بھی آنے میں خصوصی طور پر ان سے غزل کی فرمائش کرتا۔ وہ کم کو

تے۔ ایک حیرت ان کی آنکھوں میں نمایاں رہتی تھی اور وہ الگ تھلگ بیٹھتے تھے۔ یہ خبر انہوں نے ہوتے ہی دی تھی کہ اندر سمندروں بھرا "بابا" بھی ہے۔ یہ تو اشفاق احمد ہی کی نگاہ تھی جس نے انہیں چن لیا اور لاہور کے بیشتر ادیبوں کے درمیان لا بٹھایا۔

اب جو واصف صاحب نے گفتگو شروع کی تو مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ یہ کوئی دوسرا واصف ہے تبھی تو اشفاق احمد جیسا دیدہ ور اسے منتخب کر لایا ہے۔ گفتگو کیا تھی ..... الہام و دانش اتر رہے تھے میرے چہرے کی مسکراہٹ حیرت میں بدلنے لگی۔ یہ کس طرح کا بھید تھا جو آج اشفاق احمد کی کنجی سے کھل رہا تھا۔ ہر شخص تھوڑی دیر کے لئے تحیر کی گہرائی میں ڈوب گیا ہر لفظ بھا ہوا، پُر تاثیر اور مہکتا ہوا، ہمارے کم از کم میرے بھیتر میں اشک جیسی چمک کھلاتا ہوا.....

یا اللہ..... یہ بابا کون ہے؟

دو سے دن نوائے وقت میں واصف صاحب کا پورا لیکچر چھپ گیا۔ سننے میں جو کوتاہی رہ گئی تھی وہ دور ہو گئی۔ لطف اور حیرت کے بعد ایک روشنی سی اندر اترنے لگی۔ تب اشفاق احمد صاحب پہ رشک بھی آیا۔ وہ کہاں کہاں سے بابے پکڑ لاتے ہیں اور ہم جن سے اکتساب کر سکتے نہ فیض اٹھا پاتے ان واصف صاحب کو بھی "پیر" اور "بابا" بتا کر ہمیں کتنا گہرا بھید بتا دیا۔ واصف صاحب سے تعلق زیادہ گہرا ہوتا گیا۔ مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ وہ پذیرائی کرتے تھے حتیٰ کہ دفتر بھی آنے لگے۔ ایک روز کہنے لگے "جگنو سے ستارہ بننے والے ہو۔" میں نے کہا، لکھ دیجئے۔ انہوں نے لکھ دیا: "ستاروں کی طرح چمکنے والے ہو" بات آئی گئی ہو گئی۔

انہی دنوں ستمبر 83ء میں لانگ پلے "پھولوں والا راستہ" چلا تو اکتوبر کی آخری تاریخ کو محمد نثار حسین نے ہنگامی طور پر ایک پلے فوراً اس لئے لکھنے کے لئے کہا کہ جو رائٹر شیڈول میں تھا وہ ملک سے باہر جا رہا تھا۔ میں لکھنا نہ چاہ رہا تھا مگر انہوں نے میرے اوپر ڈال دیا جو انہی دنوں پریشر میں ہی "رنگوں میں اندھیرا" لکھا جو بے حد پسند ہوا اور پہلی مرتبہ دو مرتبہ چلا یعنی 29 دسمبر 83ء اور 5 جنوری 84ء کو۔

ان کے بعض سے "اندھیرا اجالا" شروع کیا اور 18 مہینے چند نوماہ تک لکھتا چلا گیا۔ بڑی عزت اور شہرت ملی۔ اس دوران میں دو مرتبہ واصف صاحب بھی آئے۔ اپنی کتاب "کرن کرن سورج" ساتھ لائے۔ سامنے بیٹھ کر اس پر لکھا "یونس صاحب کے لئے۔ فتوحات کی مبارک کے ساتھ" دستخط کے نیچے انگریزی ہندسوں میں تاریخ 3/10/84 درج ہے۔ جب تک اندھیرا اجالا کی بارہ کہانیاں ہی ٹیلی کاسٹ ہوئی تھیں ۔

"زندہ سمندر" انہوں نے مجھے 88ء میں دی تھی جس پر لکھا "یونس جاوید صاحب کے لئے دعا و محبت کے ساتھ "۱۴/۱/۸۸ (اس پر اردو بند سے لکھے تھے۔)

پی سی میں ان کے ساتھ ایک تقریب تھی۔ میں پہنچا۔ وہ صوفے پر بیٹھے تھے بہت سے احباب ادب سے کھڑے تھے۔ اعجاز بٹالوی، انور سجاد، حنیف رامے اور بہت سے دوسرے لوگ بھی احترام سے کھڑے تھے۔ میں نے سلام کیا تو مجھے کھینچ کر صوفے پر ہی اپنے ساتھ بٹھالیا۔ اس دوران میں ایک اداکارہ نے کاغذ پر اپنا سوال لکھ کر جواب لینے کے لئے میری سفارش چاہی۔ ان کی محبت سے میری اہمیت بڑھ گئی تھی مگر میں نے اداکارہ سے یہی کہا کہ آپ براہ راست ان سے کہئے۔

کبھی کبھی دفتری ملاقات کے دوران میں سراج منیر بھی ہوتا تو پھر مکالمہ شروع ہو جاتا ان کے ساتھ لا نیوں لمبی کار میں انہیں بٹھا کر لانے والا شخص دست بستہ کھڑا رہتا اور وہ میرے برابر بیٹھ کر گفتگو کرتے۔ ۸۴ء تا ۸۸ء تک کے دوران میں انہوں نے جو کتابیں مجھے عنایت کیں وہ تو بالکل سامنے رکھی ہیں۔

عجب ہے کہ جب انہوں نے کاغذ پر لکھا تھا "ستاروں کی طرح چمکنے والے ہو۔" تو میں نے بادل ناخواستہ "رگوں میں اندھیرا" اور پھر "اندھیرا اجالا" سیریز لکھی تھی مگر ان کی پیش گوئی، جس پر مجھے بالکل یقین نہیں تھا، مکمل طور پر پوری ہوئی۔ اس سیریز کی روشنی اندرون ملک سے بین الاقوامی سطح تک پھیل گئی اور مجھے ہر ملک سے تحسین کے خطوط ڈھیروں ڈھیر ملتے رہے۔ آج بھی لوگ یونس جاوید کو بھول جاتے ہیں مگر اندھیرا اجالا سے چونک کر پہچان لیتے ہیں۔

بات اشفاق صاحب کی تھی مگر واصف صاحب کا ذکر اس لئے لازمی تھا کہ وہ ان کا "بابا" تھا بہر حال اندھیرا اجالا ابھی گیارہ مہینوں تک چلا تھا کہ ایک زبردست ریفرنس اس کی پذیرائی کے لئے منعقد ہوا جس کی صدارت وفاقی سیکرٹری اطلاعات، جو پی ٹی وی کے ایم ڈی بھی تھے نے کی تھی۔ اس میں ادیبوں، ڈرامہ نگاروں اور تمام اضلاع اور صوبوں سے ڈی آئی جی حضرات بھی تشریف لائے تھے۔ پاکستان نیشنل سنٹر کی ڈائریکٹر جنرل کشور ناہید تھیں انہوں نے تمام کرسیاں اٹھوا کر فرشی نشست بنوادی کہ زیادہ لوگوں کے لئے جگہ بن سکے۔ تب بھی تل دھرنے کی جگہ نہ بچی۔ گرما گرم تقریریں ہوئیں۔ سب کے بعد اشفاق صاحب سٹیج پر آئے۔ انہوں نے زبردست تحسین کی، مجھے توقیر بھی دی اور حیرت بھی۔

ان کا یہ جملہ تو مجھ سے برداشت نہ ہو رہا تھا کہ "جو کام ہم پوری کوشش سے نہ کر سکے وہ یونس جاوید نے کر دکھایا۔"

تقریب اور اس کے بعد بھی بہت پذیرائی ہوئی مگر مجھے اشفاق صاحب کا یہ جملہ میرا دل رکھنے کی کچھ زیادہ ہی کوشش دکھائی دیا تھا...... پھر میں یہ واقعہ، یہ جملہ بھول گیا۔ برسوں بعد اندھیرا اجالا کی اشاعت کا مرحلہ آیا تو میں دیباچے کے لئے اردو سائنس بورڈان کے پاس حاضر ہوا وہ بہت خوش دلی سے ملے، ہمیشہ کی طرح ہمت بندھائی اور ہفتے بھر کا وعدہ ہی نہیں کیا، لکھ بھی دیا...... واپس آتے ہوئے مجھے کہا" پڑھ لینا"

ایسی گستاخی تو مجھ سے سرزد نہ ہوئی میں نے سرورق بنانے والے معروف مصور" خدا بخش ابڑو کے سپرد یہ دیباچہ کر دیا کہ وہ اسے مصورانہ انداز میں لکھ دے۔ واقعی اس نے بڑا آرٹسٹک لکھا...... جب میں پروف دیکھنے بیٹھا تو آخر میں نیشنل سنٹر والے جملے سے ملتا جلتا جملہ پڑھ کر رک گیا، لکھا تھا "ہمارے بعد کے آنے والے ادیبوں میں چند ایسے ڈرامہ نگار پیدا ہوئے جنہوں نے تمثیل کی دنیا میں وہ خلا پر کئے ہیں جو ہم سے ہماری پوری کوشش کے باوصف پر نہ کئے جا سکے۔ان ڈرامہ نگاروں میں یونس جاوید کا بہت اونچا مقام ہے۔"اشفاق صاحب نے کیا لکھ دیا تھا، میں پریشان ہو گیا فوراً اردو سائنس بورڈ پہنچا۔ گزارش کی کہ اس جملے کو حذف کر دیں۔انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ بولے یہ سوچ سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ میں نے دوبارہ درخواست کی...... پھر استدعا اور آخر میں "التجا" تک کہا۔ مگر انہوں نے انکار کر دیا کہا" جو لکھ دیا ہے وہی چھپے گا"۔

حیرت میں گم بوجھل قدموں سے...... لوٹتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ آغا جی یہ لکھ کر خود تو رفعتوں کو چھو رہے ہیں مگر جو کوئی پڑھے گا وہ کیا سوچے گا، لیکن چونکہ ان کا حکم یہی تھا سو یہی شائع ہوا۔

ایک بات میں پیچھے بھول آیا ہوں:"ایک محبت سو افسانے" کے ڈراموں کے مداح تو ہم بعد میں ہوئے، میرا پورا گھرانہ ان کی کتاب "ایک محبت سو افسانے" کا قاری اور مداح رہا ہے۔ یہ کتاب میری بہن بہت چھپا کر گھر لائی تھی کہ ان دنوں ہمارے گھر کے دروازے ناول اور فکشن کے لئے مقفل تھے۔ سو پہلے باجی منور نے اسے پڑھا پھر میں نے...... پھر کئی مرتبہ پڑھا اور دونوں نے ان کہانیوں پہ مکالمہ بھی کیا وہ کتاب، جلد پھٹ جانے کے باوجود اب تک میرے گھر میں تھی...... لہٰذا جب میری بیٹی اسماء نے اسے پڑھا تو وہ ہم سے زیادہ اشفاق صاحب کی مداح ہوئی حالانکہ ساتویں کلاس میں تھی اور اب میٹرک کر لینے اور کالج جانے کے بعد وہ بار بار اشفاق صاحب کے بارے میں سوالات کرتی رہتی ہے۔ ان کی کتابیں جمع کرتی ہے پڑھتی ہے اور بانو آپا اور اشفاق صاحب کے بارے میں کچھ سننا چاہتی ہے۔اسے کیا خبر ہے کہ میں تو خود ان دونوں کے اثر میں ہوں۔

ایک روز اس نے اشفاق صاحب سے آٹو گراف لے دینے کی ضد کی۔ اتفاق سے انہی دنوں

"داستاں سرائے" میں کسی مکالمے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ سو مجھے بھی بلاوا آ گیا۔ میرے علاوہ ڈاکٹر انیس ناگی، قاضی جاوید، ڈاکٹر سلیم اختر، اصغر ندیم سید اور بہت سے ادیب موجود تھے مگر اسی روز جامعہ اشرف سے کچھ علماء کو بھی دعوت دی گئی تھی۔ عجب ملی جلی مخلوق کے درمیان مکالمہ تھا۔ مذہبی علماء بھی تھے، روشن خیال بھی...... رجعت پسند بھی...... ہر طرح کا نکتہ نظر ایک چھت تلے جمع تھا۔ سو کمال کی گفتگو ہوئی۔ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ خلفائے راشدین کے زمانے کے پس منظر میں کوئی بڑی تحریر لکھنا چاہتے ہیں (خدا کرے لکھ چکے ہوں)

محفل تمام ہوئی تو میں نے اسما کے لئے آٹوگراف مانگا۔

انہوں نے لکھا: "اسماء بیٹی...... جتنا پیار تم اپنے پاپا سے کرتی ہو اس سے زیادہ پیار میں یونس جاوید سے کرتا ہوں، اس معاملے میں میں تم سے افضل ہوں"، اشفاق احمد۔

آپ کہیں گے یہ میں کیا لکھ رہا ہوں اور میں کہتا ہوں کہ اس قد کاٹھ کے دانشور، صوفی، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، ماہر تعلیم اور سب سے بڑھ کر اتنے بڑے انسان کے بارے میں میں کچھ لکھنا بھی چاہوں تو اپنے عجز کے اظہار کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ سوائے ان چھوٹی چھوٹی باتوں اور یادوں کے۔ اس مرد درویش نے اس زمانے میں اپنی محبتوں کے خزانے برابری کی سطح پر ہر شخص پر لٹائے جب لوگ تعصبات کی سوئی پر ٹلنا فخر جانتے ہیں۔ گروہی سیاست کی بیساکھیوں سے قد آوری کے دعویداروں نے رعونت کی آگ سے اپنے چہروں کو جھلسا رکھا ہے کیونکہ ذات کے شیش محل میں انہیں ہر طرف اپنا ہی چہرہ دکھائی دیتا ہے مگر جلے چہرے کے داغ دکھائی نہیں دیتے...... اس زمانے میں...... جی ہاں اس زمانے میں اشفاق احمد نے عجز اور محبت کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا۔ محبتیں بانٹیں...... آسانیاں تقسیم کرتے رہنے کی دعا دی اور گویا انسانیت کی لاج رکھ لی...... ان کی عاجزی، محبت، علم اور حلم نے ان کی زبردست انا کو اپنے جلو میں لے کر اوجھل ہی رکھا کہ وہ رب قدیر کے افضل ترین انسانوں میں...... بلند مقام پہ ہی دکھائی دینے اور دیتے رہیں گے...... ہمیشہ...... ہمیشہ۔

ان کی کہانی اور کرافٹ پہ بات کرتے ہوئے میرا تو دل دہلتا ہے ان جیسا کہانی کار جس کی کرافٹ مین شپ اتنی مضبوط اور اس قدر پرفیکٹ تھی کہ انہی کے ساتھ چلی گئی سوائے بانو قدسیہ کے کہ وہ بھی ان ہی کے برابر کی کرافٹ کے ہنر سے بخوبی واقف ہی نہیں۔ اپنی کہانیوں اور ناولوں سے گل و گلزار بناتی چلی جاتی ہیں اور حیران کن مضبوط لکھنے والی ہونے کے باوجود کہیں کہیں اشفاق صاحب سے علیحدہ بھی ہیں۔

یہ کون سا ہوسٹل تھا جہاں میں اور اظہر جاوید اکٹھے گئے تھے۔ شاید راشد ہوسٹل تھا کہ میرے

آغاجی وہاں زیر علاج تھے۔ ایک جھجک کے ساتھ ہم نے دروازے پہ ہلکی دستک دی تھی مگر خلاف توقع بانو آپا نے مسکرا کر خندہ پیشانی سے اندر آنے کی اجازت دی تو ڈھارس بندھ گئی کہ جو کچھ اشفاق صاحب کے بارے میں سن کر آئے تھے ایسی بات نہ تھی۔ معلوم ہوا پتھری نکال دی گئی ہے مگر یورک رسولی کو نہیں چھیڑا گیا، رسک تھا، سو دل کے بائی پاس کی طرح نالی لگادی گئی۔ اشفاق بستر پہ لیٹے تھے میں نے ان کا ہاتھ تھاما تو محسوس ہوا ہم دونوں نے گرم جوشی سے ایک دوسرے کا ہاتھ دبا رکھا ہے۔ دھیمے دھیمے بات کرتے رہے کہ پروین عاطف بھی ہم سے آن ملیں۔ بانو آپا بہت خوش تھیں کہ اشفاق صحت کی طرف لوٹ رہے تھے۔ تین روز پہلے جو پیلاہٹ ان کے چہرے پر تھی اس پہ سرخی غالب آ رہی تھی۔ اسی خوشی میں بانو آپا نے کیک کاٹا اور کولڈ ڈرنکس ہمارے سامنے رکھے۔

ہم نے بہت اصرار کیا کہ اب نہیں، جب آغاجی گھر آئیں گے تب دعوت ہوگی...... پھر"

"دعوت پھر بھی ہوگی" بانو آپا نے پورے یقین سے کہا تھا۔ افسوس، وہ گھر تو آ گئے مگر وہ خاص دعوت نہ ہو سکی۔ سورج جنگلوں سے پرے، دور کہیں چھپ چکا تھا۔

(ادبِ لطیف، لاہور، مئی ۲۰۰۵ء)

چور

ڈوبتے چاند کی مٹی روشنی میں اس نے نئی کے قد مچے پر کھڑے ہو کر عورت کی ناف کو آخری بار دیکھا۔ چربی کی موٹی تہہ نے گہری ناف کو نشیلی آنکھ کی طرح دنبالہ دار بنا رکھا تھا اور نسواری دامن نے اس آنکھ کے نیچے خطِ مستقیم کھینچ دیا تھا۔ دراصل وہ جس قد مچے پر کھڑا تھا وہاں سے دامن کی لکیر نیچے ہی نظر آتی تھی۔ ایک لمحے کے لئے نسواری نقاب کے اوپر وہ آنکھ سے اپنی طرف گھورتی ہوئی دکھائی دی۔ لیکن پھر اندھیرا چھا گیا اور اس کا چور دل شانت ہو گیا۔ وہ ٹٹی کے پیچھے سے باہر نکلا اور دبے پاؤں چارپائی کے پاس سے ہوتا ہوا اندر کی طرف چل دیا۔ اس عظیم الشان عورت کے ساتھ اس کا پستہ قد خاوند بھی کنڈلی مارے سو رہا تھا۔ اس نے صرف بنیان اور جانگیہ پہن رکھا تھا اور اس کا ایک زانو اپنی بیوی کی رانوں پر تھا۔ ساتھ ہی ایک کھٹولی پر دو بچے سو رہے تھے۔

جب اس نے اندر کوٹھری میں پہنچ کر دروازہ بند کیا تو اس کا دل ذرا سا گھبرایا لیکن پھر اس نے جی کڑا کر کے جیب سے چھوٹی سی ٹارچ نکالی اور دبے بھر روشنی کا بال فرش پر چھوڑ دیا۔ کمرے میں دھیمی سی روشنی ہوئی اور اس نے آگے بڑھ کر الماری کا پٹ کھولا۔

الماری دواؤں کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھی اور اس کے بیچ خانے میں ایک چھوٹے سے آئینے کے پاس کنگھی اور سرمے دانی پڑی تھی۔ اس نے اوپر اور نیچے کے خانوں میں روشنی کا روپیہ پھینکا۔ لیکن وہاں سوائے دواؤں کے اور کچھ نظر نہ آیا۔ لکڑی کی تلے دانی میں اون کی ایک گچھی، کانچ کی چوڑیوں کے چند جوڑے، سر پر لگانی کی پنیں اور بجلی کے ایک بل کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

تلے دانی سیاہ شیشم کی تھی اور اس کا بوجھ کافی تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی سیٹ الماری کے تختے پر ٹھیک نہ بیٹھی تھی۔ اس نے تلے دانی کو احتیاط سے اٹھا کر کھولا اور نیچے اسے ململ کے استر والا رجسٹری کا لفافہ دکھائی دیا۔ لفافہ دوہرا تہہ کیا ہوا تھا اور اس کے پھٹے ہوئے کونوں سے ململ کے دھاگے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس نے بڑی صفائی سے وہ لفافہ اٹھایا اور ٹارچ دانتوں میں دبا کر اسے کھولا۔ اندر نئے نئے تہہ شدہ نوٹ پڑے تھے۔ اس نے لفافے کو ناک کے قریب لا کر سونگھا۔ تازہ نوٹوں سے بروزہ اور السی کے تیل کی خوشبو آ رہی تھی۔

اس نے لفافہ اپنی جیب میں رکھا۔ ایک ایک سلائی دونوں آنکھوں میں سرمے کی ڈالی اور ہولے

ہوئے قدم اٹھاتا باہر صحن میں نکل آیا۔ مرد نے اپنا بازو عورت کی رانوں سے پرے اٹھا لیا اور دونوں ایک دوسرے سے دور ہو کر گہری نیند سو رہے تھے۔ چور نے آگے بڑھ کر آہستہ سے عورت کا دامن اپنی چٹکی سے پکڑا اور عورت کا برہنہ پیٹ ڈھانپ کر جدھر سے آیا تھا اُدھر سے باہر نکل گیا۔

دور کہیں کوئی کتا بھونکا اور اس کی رفتار تیز ہو گئی۔ اس کا دل تھوڑی سی مدت میں اتنی بڑی کامیابی پر مسرور تھا اور وہ دل ہی دل میں سیٹی بجاتا ہوا اپنی راہ چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے سرمئی اندھیرے میں سڑک کے آخری کنارے پر جن دکھائی دیا۔ اس کا سر آسمان میں تھا اور ٹانگیں زمین پر۔ چور کے قدم وہیں رک گئے۔ وہ آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اور اس کا خون رگوں میں خشک ہو رہا تھا۔ اپنے آپ اس بلا سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے سورۃ الناس کی تلاوت شروع کر دی اور جب اس نے اَلَّذِی یُوَسْوِسُ کہا تو جن بتیسی نکال کر ہنسا۔ نارنجی رنگ کا ایک شعلہ لپکا اور دو کھمبوں پر واپڈا کے ٹرانسفارمر کا فیوز اُڑ گیا۔

جب چور نے اپنی کوٹھری میں لالٹین جلا کر لفافہ کھولا تو اس میں سے سو کا ایک اور دس دس کے سات نوٹ برآمد ہوئے۔ ساتھ ہی نیلے رنگ کے کاغذ پر لکھا ہوا ایک خط بھی تھا۔

جناب بھائی صاحب۔

لعنت ہو آپ کی دولت پر اور آپ کے روپے پر جو وقت پر غریب بھائی کے کام نہ آ سکا۔ اس دنیا میں جس کا کوئی نہ ہو اس کا خدا ہوتا ہے۔ ہم کچھ چیزیں گھر کی، ایک سو روپیہ بنا لیا ہے۔ پچاس روپے ان کے ایک دوست سے مل گئے ہیں اور بیس روپے دوسرے سے۔ خدا نے چاہا تو اس رقم سے ہمارا بلو بچ جائے گا۔ ملٹری کے ڈاکٹر نے ہمیں بلو کے آپریشن کے لئے پنڈی بلایا ہے۔ خدا اس کا بھلا کرے وہ مفت آپریشن کرے گا۔ آپ سے تو غیر اچھے ہیں۔ اب ہمیں آپ کی مدد کی بالکل ضرورت نہیں۔ معاف رکھیں اور جو روپیہ آپ ہمیں بھیجنا چاہتے تھے اس سے فریدہ کو کنگن بنوا دیں۔ ہم ایک سو ستر میں پورا مہینہ پنڈی میں گزار سکتے ہیں۔ پرسوں سے ان کی چھٹی شروع ہے اور ہم صبح کی لاری سے پنڈی پہنچ جائیں گے۔ خدا آپ جیسے بھائیوں سے سب کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

خاکسار

شکیلہ بیگم

خط پڑھ کر چور کے دل پر ایک گھونسہ سا لگا اور وہ بتی بجھا کر اور اپنے کپڑے اُتار کر کھری چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا تھا اور اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ ننگے چور نے اٹھ کر کونے سے ٹھنڈی صراحی کا پانی پیا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ اس واقعے پر غور کرتے ہوئے اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور دو سیاہ آنسو اس کی کنپٹیوں پر پھیل کر بالوں میں جذب ہو گئے۔ اس پشیمانی کی حالت میں اسے نیند آ گئی اور جب وہ جاگا تو صبح کے

بس بچ چکے تھے۔ وہ خط اور روپے جیب میں ڈال کر جائے وقوعہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

شکیلہ بیگم کے گھر کے سامنے شہتوت کے چھوٹے سے پیڑ تلے ایک اے۔ ایس آئی میز کرسی ڈالے بیٹھا تھا اور دو سپاہی باری باری ایک سگریٹ کے کش لگا رہے تھے۔ شکیلہ کا پست قد خاوند تھانیدار کے سامنے کھڑا تھا اور تھانیدار پنسل سے کان کھجا رہا تھا۔ چور ان کے سامنے سے گزرا اور پیچھے نظر کئے بغیر سیدھا دوسری گلی میں چلا گیا۔ بڑی سڑک میں بس اسٹینڈ کے پاس اس نے کھوکھے والے سے سگریٹ کی ایک ڈبیہ خریدی لیکن جیب میں صرف بندھے ہوئے ایک سو ستر روپے ہونے کی وجہ سے ڈبیہ واپس کر دی۔ داتا دربار جا کر اس نے دو رکعت نماز کفارہ ادا کی۔ فوارے کا پانی اپنی سرمہ لگی آنکھوں پر پھیرا اور مزار کی طرف منہ کر کے الٹا چلتا ہوا جوتوں والے کے پاس پہنچ گیا۔ جوتے پہن کر اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور نوٹوں پر انگلیاں پھیرتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ باندھ کر کہا: ''بابا جی معاف کرنا، اس وقت ہاتھ خالی ہے۔''

جوتوں والے نے ہاتھ کے اشارے اور تیوری کے چڑھاؤ سے کہا: ''جا جا دفع ہو جا۔'' وہاں سے دفع ہو کر وہ سیدھا بھاٹی اپنے دوست کے پاس پہنچا اور اس سے دو روپے ہاتھ ادھار لے کر لنڈا چلا آیا۔ یہاں آٹھ آنے کی اس نے روٹی کھائی۔ ایک روپیہ بیٹھک میں جا کر ہار دیا اور باقی آٹھ آنے تھرڈ کلاس کے مسافر خانے میں فقیروں کو بانٹ دیئے۔ رات کے وقت جب وہ شکیلہ کے گھر کے سامنے سے گزرا تو وہاں اندر کی بتی روشن تھی۔ اس نے چاہا کہ رجسٹری کا لفافہ اندر اچھال دے لیکن پھر اسے حوصلہ نہ ہوا اور وہ دل کڑا کر کے گھر کے آگے سے گزر گیا۔

رات بھر چور اپنے ضمیر کے ساتھ جھگڑتا رہا لیکن اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ صبح اس نے اپنے ضمیر کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور مسجد کے سقاوے میں ٹھنڈے پانی سے نہانے کے بعد وہ سیدھا شکیلہ بیگم کے گھر پہنچا اور کنڈی کھٹکھٹا کر جیب میں ہاتھ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ جونہی کوئی دروازہ کھولے گا وہ رجسٹری والا لفافہ اس کے قدموں میں پھینک کر ہوا ہو جائے گا اور پھر کبھی ادھر کا رخ نہ کرے گا۔

دروازہ کھلا۔ اس کے سامنے شکیلہ بیگم کا پست قد خاوند کھڑا تھا۔ چور نے اپنی جیب سے لفافہ کھینچ کر جب پست قد آدمی کے سامنے مٹھی کھولی تو اس کے ہاتھ خالی تھے۔ اس نے اپنا ہاتھ پورا کھول کر کہا: ''میرا نام محمد علی ہے اور مجھے قریشی صاحب سے ملنا ہے۔'' شکیلہ کے خاوند نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا: ''معاف کیجئے یہاں کوئی قریشی صاحب نہیں رہتے۔''

چور نے کہا: ''یہ مکان نمبر ۲۶۳ نہیں ہے کیا؟''

''جی نہیں۔'' شکیلہ بیگم کے خاوند نے معذرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''یہ مکان نمبر ۲۶۷ ہے۔''

''اوہ معاف کیجئے گا۔'' چور نے اپنا ہاتھ ایک بار پھر اس کے سامنے پھیلایا اور مصافحہ کر کے اطمینان سے چل دیا۔

راستے میں اس کے ضمیر نے اسے پھر لعنت ملامت کرنا شروع کر دی۔ چور نے چائے والے کی دکان پر بیٹھ کر ضمیر کو سمجھایا کہ اس نے ایمانداری سے روپیہ واپس کر دینے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے ہاتھ اور اس کی انگلیوں نے ساتھ ہی نہیں دیا۔ وہ کیا کرتا!

اپنے ضمیر کے ساتھ تین دن اور تین راتیں جھگڑا کرنے کے بعد چور کی قوتِ مدافعت جواب دے گئی۔ اسے اپنے اندر کے چور پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا اور وہ اپنی توجہ کسی اور طرف لگانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک شام جیل روڈ کے سرونٹ کوارٹر سے ٹرانسسٹر ریڈیو چرایا اور لنڈے جا کر بیچ آیا۔ پینتالیس روپے اس کے تین چار دن گزارنے کے لئے کافی تھے اور وہ یہ تین چار دن کے لئے لاہور چھوڑ کر قصور چلا گیا۔

قصور میں حضرت بلھے شاہ کے قریب رہ کر اسے بڑا سکون ملا، لیکن اس کے ضمیر کو یہاں بھی آسودگی میسر نہ آئی۔ ہر شام مسجد میں سونے سے پیشتر اس کا ضمیر اس سے ایک ہی سوال پوچھتا کہ اگر تم اس روپے کی اپنی اس طرح حق حلال کی کمائی سمجھتے ہو جیسی ٹرانسسٹر ریڈیو سے حاصل کی ہے تو پھر اسے خرچ کیوں نہیں کرتے ہو۔ جیب میں کیوں لئے پھرتے ہو۔ چور اس کا ایک جواب دیتا کہ ابھی مجھے اس کے خرچے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس لئے نہیں خرچتا۔ جونہی ضرورت پڑے گی خرچ لوں گا لیکن اس کا دل اس جواب سے مطمئن نہ ہوتا تھا اور اسے کچا سا جواب سمجھتا تھا۔

چور حیران بھی تھا اور ناخوش بھی۔ اسے یہ چوری بہت مہنگی پڑی تھی۔ نہ کام آتی تھی نہ جان چھوڑتی تھی۔ آخر اس نے فیصلہ کیا کہ وہ شکیلہ بیگم کا خط پھاڑ ڈالے جو ان روپوں کے ساتھ رکھا ہوا تھا۔ چنانچہ اس نے ایک شام باہر کھیتوں میں ریل کی پٹری پر بیٹھ کر وہ خط پھاڑ کر اس کے پرزے ہوا میں اُڑا دیئے۔

رات جس وقت وہ سونے کے لئے مسجد کی صف پر لیٹا تو اس کا ضمیر پھر اسے لعنت ملامت کرنے لگا۔

چور ایک ہفتہ قصور میں گزارنے کے بعد پھر لاہور پہنچ گیا۔ مزنگ چونگی پر لاری سے اترتے ہی وہ سیدھا شکیلہ بیگم کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ اس نے راستے میں رجسٹری والا لفافہ ایک نالی میں پھینک دیا۔ ایک سو ستر کے نوٹ احتیاط سے جیب میں ڈال لئے۔ جب وہ گلی کے موڑ پر پہنچا تو اندر سے ایک بچے کا جنازہ باہر نکل رہا تھا۔ اس کا ایک پایہ پست قد آدمی کے کندھے پر تھا اور وہ زار زار رو رہا تھا۔ چور نے آگے بڑھ کر پست قد آدمی کی جگہ کندھا دیا اور پھر اس سے ایک دوسرے آدمی نے کندھا بدل دیا۔

ایک سفید ریش بزرگ شکیلہ بیگم کے خاوند کے بغل میں چل رہا تھا اور اسے صبر کی تلقین کر رہا تھا۔ ایک اور نوجوان جو غم نصیب کے دفتر کا ساتھی معلوم ہوتا تھا کہہ رہا تھا ملٹری ہسپتال سے آپریشن کا بلاوا بھی آ گیا۔ کرنل صاحب نے وعدہ بھی کر لیا تھا مفت آپریشن کا اور یہ کوئی نیا آپریشن بھی نہیں تھا۔ بس ذرا دل کی نالی میں انگلی ڈال کر اسے کھولنا ہوتا ہے۔ معمولی آپریشن ہے یہ بھی۔ لیکن اگر وقت زیادہ گزر جائے تو بس پھر یہی ہوتا ہے۔ اللہ کا حکم۔

شکیلہ کا خاوند دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور دو تین آدمی مل کر چور کو برا بھلا کہنے لگے جس نے سفر خرچ کی ساری رقم چرا لی تھی۔ چور کے ضمیر نے جیسے اس کی گدی میں زور کا دھپا مارا اور وہ زانوؤں کے بل سڑک پر گرا۔ دو آدمیوں نے اسے کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے چھلے ہوئے زانوؤں پر ہاتھ پھیرا۔ شکیلہ کے خاوند نے چور کو تشکر اور محبت بھری نظروں سے دیکھا اور جنازہ میانی صاحب پہنچ گیا۔

جب بچے کو دفنا کر سب لوگ چلے گئے تو چور بڑی دیر تک قبرستان کی دیوار پر بیٹھا رہا اور جب شام کافی گہری ہو گئی تو وہ آہستہ سے اٹھا اور جنازہ گاہ کے پھلیروں کے پاس جا کھڑا ہو گیا۔ اس نے پھولوں سے بھرا ہوا ایک چھابہ بارہ روپے میں خریدا اور سقے کو ساتھ لے کر تازہ بنی قبر پر پہنچ گیا۔ جب سقہ اس کی مرضی کے مطابق قبر کو تر بتر کر چکا تو اس نے تین روپے اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے اور ہاتھ جوڑ کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

اور جب چور قبرستان سے باہر نکلا تو ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے باقی کے ایک سو چھپن میں سے دس کا نوٹ اور نکالا اور کھوکھے والے سے بولا ایک ڈبی کیپسٹن، چار پان۔ ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے کے لئے چور کھمبے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا اور شکر کرنے لگا کی اس ایک نیک کام سے اس کے ضمیر کا بوجھ بالکل ختم ہو گیا۔

کہا جاتا ہے کہ ایک لفظ سے یہ ساری دنیا یہ ساری کائنات پیدا ہوتی ہے اور ایک لفظ ہی کے اظہار سے ختم ہو جائے گی اور ان کی پیدائش اور خاتمے کے دریان جتنا وقفہ ہو گا اُس پر لفظ ہی حکمران رہے گا۔ لفظ ہی بُرے بھلے، حق و ناحق، غلط اور صحیح میں تمیز کرے گا اور لوگوں کو گروہوں اور ٹکڑیوں میں بانٹ کر اُن کے انفرادی اور اجتماعی نام رکھے گا۔
(اشفاق احمد کے مضمون "اردو نشریات میں علاقائی الفاظ اور محاورات کا استعمال" سے اقتباس)

کیا کسی کو، پھر کسی کا......

لاہور میں جب سے ایف سی کالج بنا ہے اس میں سے سینکڑوں لڑکے تھرڈ ایئر ہی میں اپنی تعلیم چھوڑ کر چلے گئے اور پھر ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔ لیکن شبیر ان سب سے مختلف تھا۔ اس نے بھی گو اپنی تعلیم کو تھرڈ ایئر میں خیرباد کہا تھا۔ لیکن ایک اصول' ایک اعلیٰ نصب العین اور ایک آدرش کی خاطر!

آج اسی آدرش کی وجہ سے شبیر امریکہ میں پہنچ چکا ہے اور ابھی اور کئی سال تک وہیں رہے گا اور وہیں اپنی نیک پاک' سرخ و سفید صحت مند زندگی کا سنہری زمانہ گزارے گا۔

جب ملک میں ہیروئن کی وبا کا قصہ عام ہوا اور گلی' محلوں میں پاؤڈر فروخت کرنے والوں کے اڈے قائم ہوئے اور ایک غلغلہ تازہ سے مملکت خداداد کے در و دیوار لرزہ براندام ہو گئے تو شبیر نے کیمسٹری کی کلاس میں بیٹھے بیٹھے سوچا کہ اسے اپنے ہم وطنوں کے لئے باہر نکل کر کام شروع کرنا چاہیے۔ چنانچہ بے کسوں اور بے سہاروں کی مدد کرنے کے لئے شبیر اپنی کلاس سے باہر نکلا اور پھر نکلا ہی چلا گیا۔

سب سے پہلے اس نے اپنے شہر کے سب سے بڑے ہسپتال سے رابطہ قائم کیا۔ جہاں نشے باز مریض دنیا و مافیہا سے بے نیاز سفید و براق بستروں پر دراز تھے اور ان کے سرہانے ان کے اعمال نامے لٹکے ہوئے تھے۔ شبیر کو ان خوبصورت نوجوانوں کی اٹھتی جوانیوں پر بڑا ترس آیا جنہیں نشے کے تیزاب نے چاٹ کر چھلنی کی طرح کھوکھلا کر دیا تھا اور جن کے رخسارے چہروں سے بہت اوپر اٹھ آئے تھے۔ خدا کا شکر ہے ان کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ شبیر نے پڑھائی چھوڑ کر ایک والنٹیر کی حیثیت سے وہاں نام درج کرا لیا۔

پندرہ دن بعد جب شبیر کو نشے کا اور نشے باز کا' ہیرو کا اور ہیروئن کا' سپلائر کا اور دلال کا پورا علم ہو گیا تو کیمسٹری کے ایک اچھے سٹوڈنٹ کی طرح اس نے نشے پر ریسرچ کا کام شروع کر دیا۔ سب سے زیادہ کتابیں اسے امریکن سینٹر کی لائبریری سے ملیں۔ اس کے بعد باغ جناح کی لائبریری اور

کچھ پی سی ایس آئی آر کے کتب خانے سے۔ یہ سب اس کا مقصد پورا کرنے کے لئے کافی تھیں۔ چند ہی دنوں کے اندر اندر وہ منشیات کا ایک عمدہ ریسرچ سکالر بن گیا ور اس کو ایسی اصطلاحات یاد ہو گئیں جن کا علم ان ڈاکٹروں کو نہیں تھا جن کے وارڈوں میں نشے کے مریضوں کا علاج ہو تا تھا۔

شبیر کے گھر والوں نے اسے بہت سمجھایا۔ مستقبل کا خوف دلایا۔ حتیٰ کہ جائیداد سے عاق کرنے کی دھمکی بھی دی لیکن اس کے دل پر ان دھمکیوں کا ذرہ برابر اثر نہ ہوا اور وہ مشن کے اندر ہزارپائے کی طرح اور بھی آگے دھنس گیا۔ شبیر دراصل نیکی' سچائی' اصول اور انصاف کا دیوانہ تھا اور اس کے اندر ایک مشنری کی روح تھی۔ وہ ساری دنیا کو خوشحال' فارغ البال' نیک پاک' مفید اور مثبت دیکھنے کا متمنی تھا۔ اور اس سمت میں کام کر رہا تھا۔ اس کے ماما جی میں بھی یہ بات تھی اور وہ تبلیغی جماعت کا بستر لے کر دور دور کے چکر لگایا کرتے تھے۔ لیکن ان دونوں کے کام کی نوعیت میں فرق تھا۔ جذبہ گو ایک جیسا تھا اور لگن ایک ہی طرح کی تھی۔ لیکن دونوں اپنے اپنے کام کو زیادہ معتبر سمجھتے تھے۔

فائزہ سے شبیر کی ملاقات گوئٹے انسٹی ٹیوٹ میں ہوئی جہاں وہ ایلو میسم کی سیڑھی پر چڑھی ڈرامے کے فلیٹ اتار رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑا سا زنبور تھا جس سے وہ فلیٹوں کی کیلیں نکال نکال کر زمین پر پھینک رہی تھی اور زمین پر سے اس کی بڑی عمر کی سہیلی رقیہ اٹھا اٹھا کر انہیں سمیٹ کر تھیلے میں ڈال رہی تھی۔ شبیر ان سے فلیٹ مانگنے گیا تھا تاکہ ہسپتال کے لان میں جوڑ جاڑ کر ایک چھوٹا سا سیٹ لگا سکے۔ اور ان والدین کو اپنا لکھا ہوا ڈرامہ دکھا سکے جن کے بچے منشیات وارڈ میں داخل تھے۔

فائزہ نے کہا کہ وہ اس کو فلینس اور سٹیج پراپرٹی کے علاوہ ایسے ڈرامے بھی لکھوا کر دے سکتی ہے جو نشے کے خلاف ہوں اور جن سے لوگوں کے دلوں میں ہیروئن کے خلاف نفرت کی لہر دوڑ سکے۔ شبیر نے حیران ہو کر کہا "یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے کہ لوگوں کے دلوں میں برائی کے خلاف نفرت پیدا ہو جائے"۔

"اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے" فائزہ نے ایلو میسم کی سیڑھی پر وزن تول کر اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور مسکرا کر کہا "اس ایک چھوٹی سی نفرت پیدا کرنے کے لئے اتنے ڈھیر سارے کام کرنے پڑتے ہیں۔"

"بڑی محنت کرنی پڑتی ہے۔ رقیہ نے دکھی ہو کر کہا' نہ دن کی خبر رہتی ہے' رات کی' نہ اپنا کچھ پتہ ہوتا ہے نہ گھر والوں کا۔ "پھر بھی لوگ بڑی آہستگی سے بلتے ہیں" فائزہ نے کہا "اپنے

کھونٹے سے ہی بندھے رہتے ہیں۔"

" لیکن نفرت تو ایک نیگیٹو عمل ہے" شبیر نے ذرا رک کر کہا۔ فائزہ نے بڑی حیرت سے اور بڑے غور سے اس کو دیکھا اور پھر تھوڑی دیر چپ رہنے کے بعد بولی۔ "برائی کے لئے جب تک نفرت پیدا نہیں ہو گی برائی دور کیسے ہو گی۔"

شبیر نے کہا "آپ بھی نشے کے خلاف ڈرامہ وغیرہ کرتی ہیں؟"

فائزہ نے کہا " ہم مجموعی طور پر جہالت کے خلاف جہاد کرتے ہیں۔ اس میں نشہ اور نشے کے نقصانات کا ذکر بھی آ جاتا ہے۔ لیکن ہم نے خصوصی طور پر کوئی ڈرامہ نشے کے خلاف نہیں کیا۔ یہ اب آپ کا کام ہے۔"

"آپ زیادہ تر کس قسم کے ڈرامے کرتی ہیں " شبیر نے آہستگی سے پوچھا۔

فائزہ نے فخریہ لہجے میں کہا "بتایا تو ہے کہ ہم جہالت کے خلاف اور علم کے حق میں ڈرامے کرتی ہیں۔ ان میں پرانے رسم و رواج، پیر پرستی، توہم پرستی، بے جا مذہب پرستی، بے عملی اور ست روی کے خلاف شدید جھنجھوڑیاں ہوتی ہیں۔ دراصل ہمیں ملا نے بداخلاق بنا دیا ہے۔"

" یہی نہیں ہم زمینداروں اور وڈیروں کے ظلم بھی دکھاتے ہیں جو وہ بیچاری اور مظلوم عورتوں پر ڈھاتے ہیں۔" رقیہ نے غصے سے کہا اور اس کے غصے میں بڑا خلوص تھا۔

فائزہ بھی سیڑھی سے اترتے ہوئے ذرا سی ڈگمگائی تو شبیر نے دونوں بازو کھول دیئے۔

فائزہ نے ہنس کر کہا " یہ تو ان فارن مشنوں کی مہربانی ہے جو ہمیں فورم مہیا کر دیتے ہیں ورنہ اپنے لوگ تو ہمیں کبھی بھی ایسے ترقی خواہ ڈرامے نہ کرنے دیں دراصل ہمارے یہاں جہالت بہت ہے۔ "

" وہ کیوں؟" شبیر نے پوچھا تو فائزہ حیران ہو کر بولی " ہمارا ملک رجعت پسندوں اور بنیاد پرستوں کی گرفت میں ہے اور وہ اسے ترقی یافتہ تقاضوں کے مطابق آگے بڑھنے سے روکتے ہیں۔ وہ مرد عورت کے میل جول سے گھبراتے ہیں نوجوانوں کے گانے بجانے کے خلاف ہیں۔ بدلتے فیشن اختیار کرنے کو گناہ سمجھتے ہیں۔ کارخانے لگانے اور ملک کو صنعتی بننے سے روکتے ہیں۔ ریل کار، ہوائی جہاز، ٹی وی، ریڈار، کمپیوٹر کو ناپسند کرتے ہیں اور چھکڑے بیل گاڑی گدھا گاڑی، اختیار کئے رکھنے کے خواہشمند ہیں"۔

شبیر حیرانی سے فائزہ کو تکے جا رہا تھا اور وہ کہہ رہی تھی" ہم لوگ لونڈی غلام پسند کرتے ہیں اور کوایجوکیشن کے خلاف ہیں۔ ہنڈی کو اختیار کرتے ہیں،ماڈرن بینکنگ کے خلاف ہیں۔ گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں اور ماڈرن کھیلوں سے نفرت کرتے ہیں۔ راجہ نل کے زمانے کا جوا کھیل لیتے ہیں لیکن

لاٹری کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ مہذب لوگ چاند پر پہنچ گئے اور ہم ابھی تک ٹوٹکوں میں نیاز بانٹتے پھرتے ہیں۔" یہ کہتے کہتے فائزہ اچانک رک گئی اور اس کی آنکھیں شدت غم سے نمناک ہو گئیں۔ وہ اپنی قوم کی جہالت پر شرمندہ بھی تھی اور دکھی بھی۔ اپنے ملک کی پس ماندگی سے خجل بھی اور اپنے ہم وطنوں کی توہم پرستی پر اشک آور بھی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں تشکر کی ایک روشن لکیر بھی نمایاں تھی جو اس فارن مشن کے لئے تھی جس نے فائزہ کے ہم وطنوں کو ان کی قدیم اور پس ماندہ تہذیب سے نکال کر اپنے جدید اور مستند کلچر سے وابستہ کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ فائزہ کے دکھی چہرے پر ویسے بھی اطمینان کی ایک ہلکی سی تہہ نظر آ رہی تھی جو افریقہ میں انگریز مشنریوں کے ساتھ کام کرتے ہوئے مقامی لوگوں کے چہروں پر ہوتی ہے۔

شبیر نے ہسپتال کے لان پر ڈرامہ کیا ضرور اور فائزہ نے سیٹ لگانے اور سٹیج سجانے میں اس کی پوری پوری مدد کی لیکن اس کے ڈرامے کا سکرپٹ کمزور تھا۔ لکھنے والے نے یہ ڈرامہ نشے کے خلاف لکھ دیا تھا اور اس میں ہیروئن کا حصہ بقدر جثہ ہو کر رہ گیا تھا۔ فائزہ نے وعدہ کیا کہ ڈرامہ وہ اپنے ڈرامہ نویس سے لکھوائے گی جس کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور جس کی ریسرچ انٹرنیشنل اداروں کی سوچ کے ساتھ صحیح مناسبت رکھتی تھی۔

فائزہ کا رنگ چمپئی۔ آنکھیں موٹی، بال چھوٹے اور جینز اونچی تھی۔ موٹے موٹے سرخ و سیاہ جوگرز میں وہ ہانگ کانگ اور سنگاپور کی وڈیو شاپ کی سیل گرل دکھائی دیتی تھی۔ ایسی لڑکیوں پر منٹو نے اور عسکری نے بڑے اچھے اچھے افسانے لکھے تھے اور اس زمانے کی بتو چھپائی سے بھی ایسی لڑکیوں کی مہک آتی تھی۔

شبیر فائزہ سے مل کر بہت ہی خوش ہوا۔ اس نے نہ صرف شبیر کو مقامی سفارتی اداروں سے روشناس کرایا بلکہ اس کے ذہن کے وہ جالے بھی صاف کرنے میں مدد دی جو اس کے اردو میڈیم خاندان کی کم علمی کی وجہ سے چھائے ہوئے تھے۔ اس نے شبیر کی وہ دیہاتی جھینپ بھی ڈیڑھ مہینے کی مدت میں دور کر دی جو ایف سی کالج سے تین سال میں دور نہ ہو سکی تھی۔ ساتھ ہی اس نے شبیر کے ہاتھ میں خود اعتمادی کا وہ سانٹا بھی تھما دیا جو وہ خفت کے کسی بھی لمحے پر چٹاخ کر سامنے کے دیسی شیر کو آگ کے ہالے میں سے نکال سکتا تھا۔ یہ باتیں نہ تو اس کے گھر والوں کو معلوم تھیں نہ کتابوں میں لکھی ملتی تھیں اور نہ ہی اس کے حلقہ یاراں میں سے کسی کے علم میں تھیں۔

چند مہینے گزرنے کے بعد شبیر نے نشہ وارڈوں میں ڈیوٹی دینے کے بجائے نشہ سے اجتناب کرانے والی انجمنوں کا ساتھ دینا شروع کر دیا۔ وارڈوں میں چونکہ مریض کم ہوتے تھے اور

ڈاکٹروں کی تحقیق کے مطابق یا تو ان کے لواحقین انہیں داخل کروانے سے شرمندہ ہوتے تھے یا داخل کروانے کے بعد انہیں کنٹرول نہیں کر سکتے تھے کہ وہ بھاگ جاتے تھے۔ یا ان کے پاس بھاری فیس بھرنے کے لئے پیسے نہیں ہوتے تھے یا وہ اپنے عزیزوں پر یہ بھید کھلنے نہیں دیتے تھے کہ ان کے لخت ہائے جگر نشے کے عادی نہیں اس لئے سارے ہسپتالوں کے متعلقہ وارڈ عام طور پر خالی سے تھے۔

پہلے تو نشے سے نفرت کرانے کے لئے شبیر نے دو صفحی رنگین پمفلٹ شائع کرایا پھر ایک مخیر آدمی کی مدد سے اس نے آٹھ صفحے کا باتصویر کتابچہ چھپوایا اور اسے بک پوسٹ کرا کے ملک کے کونے کونے میں پھیلا دیا۔ دور دور کے لوگوں کو پاکستانیوں کی ایک اور برائی کا علم ہوا اور انہوں نے رشوت، چوری، بے ایمانی، منافقت، ملاوٹ، چور بازاری کی واقعاتی البم میں ایک اور رنگین تصویر کا اضافہ کر لیا۔ اس کتابچے کی اشاعت کے بعد جب شبیر کو ڈپٹی کونسلیٹ جنرل نے اپنے دفتر بلا کر تیس ہزار کا چیک دیا کہ اس رقم کو نشہ کے خلاف جہاد میں جس طرح چاہو خرچ کر دو تو شبیر کو پہلی مرتبہ اپنی تعلیم بیچ ہی میں چھوڑ دینے کی دلی خوشی ہوئی۔

اس نے اپنے ہم خیال اور ہم حال نوجوانوں کی ایک چھوٹی سی انجمن بنائی۔ پھر اس کا عمدہ دار اور رکن چن کر انجمن کو باقاعدہ طور پر رجسٹرڈ کروایا اور ابلاغ کے سارے محاذوں پر نشہ کی لعنت کے خلاف گولہ باری شروع کر دی۔ اس بے ریا و بے مزد ان تھک کاوش کے نتیجے میں آگہی کا موجیں مارتا دریا امڈا اور اس نے نشہ نہ کرنے والوں کو ان تلخ حقیقتوں سے آگاہ کیا جن سے وہ اب تک ناآشنا بھی تھے اور بے تعلق بھی۔ اس نئے تعلق نے ان میں سوچ کی نئی لہریں پیدا کر دیں اور وہ ان نشہ بازوں اور نشہ فروشوں کو تلاش کرنے لگے جنہیں راہ راست پر لانا ان کا فرض منصبی بن گیا تھا۔ نشہ باز اس علم سے یوں فائدہ نہ اٹھا سکے کہ وہ سر اٹھانے کے اہل نہیں تھے۔ کسی کی بات کیا سنتے۔

ڈپٹی کونسلیٹ جنرل کی بیوی مسز ایڈگر شافنر شبیر کے ساتھ مل کر کام کرنے لگی۔ کبھی کبھی جب فائزہ کو اپنے اپ لفٹ کے ڈراموں سے فرصت ہوتی تو وہ بھی شبیر کے ساتھ ہاتھ بٹانے آ جاتی لیکن اس کو فرصت کم ہی ملتی تھی کیونکہ اس کا مشن شبیر کے مشن سے ارفع تھا اور وہ اپنے توہم پرست معاشرے کو پسماندگی کے بھنور سے نکال کر ایک اونچے اور مہذب مقام پر لے جانے کی متمنی تھی۔ شبیر نے اسے ساڑھے سترہ ہزار کا فنڈ دے کر اپنے لئے بھی ایک ڈرامہ کروایا تھا جسے مسٹر اور مسز ایڈگر شافنر کے علاوہ دوسرے گوروں نے بھی بہت پسند کیا اور اس کے تھیم سانگ کو جو ایک اشتہاری جنگل کے انداز میں بنایا گیا تھا کسی حد تک یاد بھی کر لیا۔ گورے وہ جنگل گاتے بڑے ہی

پیارے لگتے!

ایک سال بعد جب شبیر کا دل اس مہم سے بھی بھر گیا اور اس نے اپنی اس مہم کو اوج کمال پر پہنچا کر اس کے لوکل فنڈ کو فارن ایکسچینج فنڈ کے ساتھ اپنے دوستوں کو منتقل کر دیا تو مسٹر ایڈگر نے اس سے پوچھا کہ اب وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

منشیات کی لعنت دنیا کے کونے کونے میں پھیل رہی تھی اور شبیر اس کی بڑھتی ہوئی طلب کے بارے میں بہت ہی پریشان تھا۔ نشہ باز کی طلب' پرچونیئے کی طلب' سپلائر کی طلب اور را میٹریل کی طلب دن بہ دن بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک رات شبیر نے را میٹریل کی سپلائی لائن کاٹنے کی بابت سوچا تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی کہ سپلائی لائن آسانی سے کٹ سکتی ہے اور اس کے خاطر خواہ نتائج نکل سکتے ہیں۔ وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح اپنے بستر پر بیٹھ گیا اور خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا۔ بہت پہلے عید راتوں کو اس کے ساتھ ایسے ہی ہوا کرتا تھا اور وہ ساری ساری رات سو نہ سکتا تھا۔ آج کی رات عید رات تو نہیں تھی لیکن اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔

مسٹر ایڈگر نے شبیر کو اس کی خواہش کے مطابق اسے انٹرنیشنل مشن میں داخل کروا دیا جس کا کام پوست کے کھیتوں پر زہریلی دوائیں چھڑک کر انہیں جلانا اور فصل کو تلف کرنا تھا۔ ایک چھوٹے سے جہاز میں شبیر پائلٹ کے ساتھ بیٹھ کر پاکستان کی ایئر سٹرپ سے ٹیک آف کرتا اور علاقہ غیر میں جا کر لالہ رنگ فصلوں پر ایسڈ کی پھوار پھیلا دیتا۔ جہاز چلانا امریکی پائلٹ کا کام تھا اور پھوار کا بٹن کھولنا شبیر کا۔ دونوں میں کچھ ایسی ہم آہنگی ہو گئی تھی کہ ایک دوسرے سے بات کئے بغیر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کی بات سمجھ جاتے تھے۔

نیچے پوست کے کھیتوں میں بڈھے بڈھے کسان ان کی بہوئیں اور پوتے پوتیاں اڑتے ہوئے جہاز پر پتھر پھینکتے اور پھر اپنے ہی پھینکے ہوئے پتھروں کے نیچے سے بھاگ کر ایک طرف ہو جاتے۔ شبیر اور پائلٹ ان کی بے چینی' گریز پائی اور گندی گالیوں والی چیخوں سے بہت لطف اندوز ہوتے۔ پائلٹ تو نیچے کو جھول مار کر بڈھے بابوں کو صرف آنکھ مارتا البتہ شبیر دونوں ہاتھ کھڑکی کے پاس کر کے دو گھومتے ہوئے ٹھینگے دکھائے جاتا' دکھائے جاتا اور زور زور سے ہنسے جاتا۔

پورے ایک ہفتے کے اس آتشیں آپریشن سے پری کی تقریباً تین چوتھائی فصل تباہ ہو گئی اور مسٹر ایڈگر نے دوسرے مغربی ممالک کے نمائندوں کے اشتراک سے شبیر کو ایک خصوصی انعام دینے کی تجویز پیش کی۔ اس کو یہ انعام مل بھی جاتا لیکن اس طرح کا ایک آپریشن کلین اپ ترکی میں بھی ہوا جس میں دو ترکی نوجوانوں نے ولائتی پائلٹوں کے ساتھ مل کر شبیر سے بھی بڑھ کر کام کیا کہ

انہوں نے پوست کی فصل کے ساتھ ساتھ نشہ تیار کرنے دو لیبارٹریاں بھی جلا ڈالیں۔ چنانچہ طے پایا کہ انقرہ میں ایک خصوصی تقریب منعقد کی جائے اور شبیر کو وہاں بلا کر ان دو ترک نوجوانوں کے ساتھ خصوصی انعام سے نوازا جائے۔

اپنے ملک سے باہر شبیر کا یہ پہلا سفر تھا اور اپنے ملک کے اندر اخباروں میں اس کی تصویر پہلی مرتبہ شائع ہوئی تھی۔ تصویر دیکھ کر اس کے گھر والوں کی کسی حد تک تشفی ہوئی کہ برخوردار بیکار وقت ضائع نہیں کر رہا اور وہ جو تھرڈ ایئر بیچ میں چھوڑ کر بھاگا تھا تو اس کی مکافات بہتر طور پر ہو رہی تھی۔

ترکی میں شبیر کا قیام دو ہفتے کا تھا لیکن اس کی خصوصی خواہش پر اس میں ایک ہفتے کا اور اضافہ کر دیا گیا جو تمغے اس کو ترکی کی مختلف تقریبوں میں ملے ان میں سب سے بڑا تمغہ امریکی سفیر مقیم ترکیہ کا تھا جس نے شبیر کو امریکا کی زندگی اور وہاں کی ان انجمنوں سے متعارف ہونے کی پیش کش کی جو منشیات کے خلاف مصروف عمل تھیں۔ شبیر نے بے حد احترام و بے حد شوق یہ دعوت قبول کر لی اور ترکی ہی سے سیدھا امریکا روانہ ہو گیا۔

امریکا میں اس کا دورہ بڑا ہی دھرل دنڈی قسم کا تھا آج ایک شہر میں سے تو کل دوسرے میں۔ ابھی ٹھیک سے دوسرے میں پہنچا ہی نہیں کہ تیسرے والوں نے بلا بھیجا۔ جوڈی نے ہنس کر کہا' تم تو ایک بڑ بیلے بریٹی بن گئے شبیر' اتنی مانگ تو ٹی وی سیریل شاروں کی نہیں ہوتی۔ شبیر نے جوڈی کے پیلے گول کندے پر ہاتھ رکھ کر اسے زور سے دبایا اور کہا "ہم تو پھر ایسے ہی ہوتے ہیں آگے تیری مرضی ہے"۔ اپنی مرضی والی جوڈی ذرا اور زور سے ہنسی تو اس کا پیلا سوئٹر پیٹ سے اوپر کو اٹھ گیا۔ شبیر نے دیکھا کہ جوڈی کی رانیں اس کی جینز میں اس بری طرح سے پھنسی ہوئی تھیں کہ انہوں نے دو جگہوں پر زور مار کر جینز کے تین تین ٹانکے بھی توڑ دیئے تھے۔ شبیر نے کہا "تمہارا یہ پیلا سوئٹر تو کسی حد تک میری سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ جینز تم کس طرح سے پہنتی ہو؟۔

جوڈی نے اپنی جینز کی طرف دیکھ کر فاتحانہ انداز میں کہا "یہ شوڈی مورگن سٹور کی جینز ہے اور وہیں پہنی جا سکتی ہے۔ یہ بات شبیر کی سمجھ میں نہ آئی اور وہ اسی طرح کھڑا رہا۔

جوڈی نے کہا' جینز پسند کرنے کے بعد ہم جینز پہننے کے کمرے میں جاتی ہیں جہاں نائلون کی تنی ہوئی چارپائیاں بچھی ہوتی ہیں۔ اس چارپائی پر لیٹ کر ہم جینز پہنتی ہیں اور پھونک پھونک کر اور پہلو بدل بدل کر ان کو اوپر چڑھاتی ہیں۔ جب انہیں اوپر چڑھا کر ہم بالکل ہف جاتی ہیں تو سٹور کے ملازم آ کر ہمارے پیتل کے بٹن بند کر دیتے ہیں اور ہم کو کندھوں اور ٹخنوں سے پکڑ کر زمین پر

کھڑا کر دیتے ہیں۔ "اچھی لگتی ہے ناں جوڈی نے پوچھا"۔

"اس کے لئے بڑی قربانی دینی پڑتی ہے شبیر" جوڈی نے سنجیدگی سے کہا" ہم دن بھر کچھ پیتی نہیں ہیں نہ سافٹ ڈرنک نہ ہارڈ ڈرنک نہ کوک نہ شربت۔

شبیر کچھ اور بھی پوچھنا چاہتا تھا لیکن رک گیا۔ وہ ایک پردہ دار گھرانے کا لڑکا تھا اور اتنی دور تک پہنچنے کی اسے پریکٹس نہیں تھی۔

جوڈی شبیر کے سپانسرز کی میڈیا گرل تھی جو گائیڈ کی صورت میں شبیر کی آئی ٹیزی کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ امریکا کے چھوٹے بڑے شہروں کے چھوٹے بڑے ہالوں میں نشے کی لعنت کے خلاف شبیر کے لیکچر ہوتے اور درسگاہوں کی سیمیناری میں سوال جواب کی میٹنگوں میں شبیر کی کارکردگی کو ریکارڈ کرنے اور اس ریکارڈنگ کی کاپیاں تیار کرکے سپانسرز کو بھیجنے کا کام جوڈی کے ذمہ داری تھی۔ شبیر نہ صرف اپنی گفتگو میں تیز ہو گیا تھا بلکہ اس کا لب و لہجہ بھی امریکی ہو گیا تھا۔ اپنی ٹوننگ میں اس نے گولائی والی آر اور وائی کی مطلوبہ کشش کی بھی مہارت حاصل کر لی تھی اور اب اس کو سوال کرنے والے کو بار بار پارڈن نہیں کہنا پڑتا تھا۔

امریکا کی مختلف ریاستوں اور مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے جب شبیر شکاگو پہنچا تو اسے پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ نشہ بازوں کا اصل مقام کیا ہے اور ان کو معاشرے میں کس احتیاط اور حفاظت کے ساتھ رکھا جا رہا ہے۔ ان کی بحالی کے لئے کیسی کیسی انجمنیں قائم ہیں اور ساتھ ہی ساتھ کتنے بڑے بڑے ادارے نشے کی افزائش کے کاروبار میں مصروف ہیں۔ کتنے بڑے بڑے لوگ بیک وقت نشے کی خرید و فروخت کے کاروباری چیف بھی ہیں اور نشے کی لعنت کے خلاف انجمنوں کے صدر بھی، مالی فراغت ان کو منشیات کا کاروبار عطا کرتا ہے اور عالمی شہرت ان کو انسداد منشیات کے پیٹرن ان چیف ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ اور یہ کوئی ایسی منافقت کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ منافقت، شجاعت، عدالت، رفاقت، خلافت وغیرہ کے الفاظ کم ترقی یافتہ زبانوں اور کم ترقی یافتہ علاقوں میں استعمال ہوتے ہیں گو ان چیزوں کا چلن اب وہاں بھی نہیں ہوتا۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں لیٹے لیٹے اس نے سپانسرز کا خط پانچویں مرتبہ پڑھا اور اسی سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ لوگ اب اس سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہیں۔ گو خط میں کوئی ایسی بات نہیں تھی۔ جس سے ناراضگی یا برہمی کا احساس ہوتا تاہم خط کی تحریر کے مجموعی تاثر سے شبیر کی طبیعت پر بوجھ سا پڑ گیا تھا۔ اس کے دروازے پر ہلکی سی ایک دستک ہوئی پھر دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ پھر ایک اور ناک ہوئی اور دروازہ پورا کھل گیا سامنے جوڈی جینز اور سوئٹر میں تنی چیونگ گم چبا رہی

تھی۔ شبیر جھپاک سے اٹھ کر بستر پر چوکڑی مار کر بیٹھ گیا تو جوڈی نے کہا "یوگا! یوگا!!"

نہیں یار' شبیر نے آگے ہو کر کہا "کہاں کا یوگا اور کہاں کا منڈلا' میں تو تم کو دیکھ کر ایسے ہی کنڈلی مار کر بیٹھ گیا ہوں' میری نیت میں کچھ فتور سا پیدا ہو رہا ہے۔"

"یہ سب شکاگو کی آب و ہوا کا اثر ہے" جوڈی بھی اس کے سامنے کنڈلی مار کر بیٹھ گئی اور ہاتھ جوڑ کر بولی "شکتی چھوڑو شکتی میں اسے ہضم کرنا چاہتی ہوں۔"

شبیر نے کہا "شکتی کو مار گولی' یہ بتا میرے سپانسرز کو کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں" جوڈی نے منہ سے پٹاخا بجا کر کہا' "تم سے بہت خوش ہیں اور تمہاری وجہ سے مجھ سے بھی خوش ہیں۔"

شبیر نے کہا "اس مرتبہ جو انہوں نے پندھرواڑے کا پتہ بھیجا ہے تو ساتھ ایک خط بھی ہے۔"

خط! "جوڈی نے حیران ہو کر کہا" خط کس بات کا۔

خط اس بات کا "شبیر نے کہا کہ اس میں کچھ ہدایات ہیں"

"مثلا"" جوڈی نے چیونگ گم کی گولی منہ سے نکال کر ہتھیلی پر رکھ لی۔

"مثلا" یہ کہ انہوں نے ہدایت کی ہے کہ میں اپنی تقریروں میں اور سیمینار کے مباحثوں میں نشہ سے مراد صرف ہیروئن لیا کروں اور دوسرے نشوں کی تفصیلات نہ بیان کروں۔ دوسرے یہ کہ یہاں کے لوگوں پر زیادہ زور نہ دیا کروں کہ وہ ہیروئن کا استعمال بند کر دیں تاکہ اس کی کھپت میں کمی ہو۔ اور طلب میں کمی کے ساتھ ساتھ اس کی سپلائی بھی کم ہو جائے۔" شبیر نے نگاہیں اٹھا کر جوڈی کی طرف غور سے دیکھا اور مسکرا کر کہا "انہوں نے پرزور درخواست کی ہے کہ میں پاکستان میں سپلائی کے اڈوں' پوست کے کھیتوں اور ہیروئن کی تیاری کی تفصیلات زیادہ بیان کیا کروں اور پاکستان میں نشے بازوں کی بڑھتی ہوئی تعداد سے بھی حاضرین کو آگاہ کیا کروں کہ ہر مہینے میں ان میں کس طرح سے جیومیٹریکل پراگریشن ہوتا ہے۔"

"تو یہ کیسے ہو سکتا ہے شبیر" جوڈی نے ہمدردی جتاتے ہوئے کہا' "نشے بازوں کی تعداد کوئی رجسٹر تھوڑی کی جاتی ہے کوئی کمپیوزر پر تھوڑی چڑھائے جاتے ہیں ان کے نام اور پتے"

"ویسے ایک عام اندازے کے مطابق تو کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں پندرہ لاکھ کے قریب لوگ نشہ کرتے ہیں" شبیر نے کہا "خیر اسی طرح سے تو بیس لاکھ' بلکہ پچیس لاکھ بھی کہا جا سکتا ہے۔" جوڈی بولی۔

"میں تو کبھی کبھی تھری ملین بھی کہہ جاتا ہوں خطابت کے زور میں" شبیر نے جواب دیا۔

"چلو کون فیتہ لے کر ماپنے آتا ہے یا کیلکولیٹر لے کر گنتی کرنے آتا ہے جو بھی دل میں آئے کہہ دیا کرو"

پھر دونوں ہنسنے لگے اور بڑی دیر تک ہنستے رہے۔ لیکن شبیر کو اس کی ہنسی کے پیچھے یوں لگا جیسے جوڈی کو بھی اسی خط کی کاپی مل چکی ہے اور وہ اس کے مندرجات سے بھی بخوبی واقف ہے۔

آدھی رات کے بعد جب جوڈی اس کے کمرے سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تو شبیر سوچنے لگا کہ امریکا کتنا اچھا ملک ہے کہ اس میں ہر طرح کی آزادی ہے اور اس میں کسی قسم کی گھٹن کا نشان تک موجود نہیں۔ کیا دلکش فضا ہے کہ یہاں امیر آزاد ہے۔ غریب آزاد ہے۔ شرابی آزاد ہے۔ پادری آزاد ہے۔ محتسب اور رند دونوں آزاد ہیں۔ ڈاکو' قاتل' راہزن آزاد ہے' مقتول' مظلوم' مقہور آزاد ہے۔ یہاں کوئی راہب' رشی ' فقیر بن کر جی سکتا ہے۔ باگھ' بھیڑیا بھالو بن کر زندہ رہ سکتا ہے۔ کسی پر کوئی پابندی نہیں' کوئی پہرہ نہیں۔ کوئی سختی نہیں۔ کوئی مجبور نہیں' مایوس نہیں دلگیر نہیں--- کاش یہ چلن ہمارے ملک میں بھی ہوتا۔ واحسرتا کا یہ زندگی ہم نے بھی اختیار کی ہوتی۔ یہ اجتماعی نظام ہمارا بھی ہوتا۔ پھر تھکاوٹ' نیند اور جوڈی کے ساتھ بھی صحبت کے کسل سے اس کی سوچ ہچکولے کھانے لگی اور وہ جھٹکے کھاتا ہوا خیال کی ایک اور ہی وادی میں اتر گیا۔

امریکہ کے مختلف شہروں میں دو مہینے اور گیارہ دن صرف کرنے کے بعد شبیر اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ دنیا بھر میں ہیروئن کی سب سے زیادہ کھپت امریکہ میں ہی تھی اور اس کے استعمال کرنے والوں میں کالے' گورے' چینی' ملائز' اور پورٹوریکن کی کوئی تخصیص نہیں تھی۔ ایک خاص سسٹم کے تحت اس لعنت کی کھیپ باقاعدگی سے مختلف ساحلوں پر اترتی تھی اور پھر ایک طے شدہ پروگرام کے تحت سارے ملک میں پھیل جاتی تھی۔ لوگوں کی صحت پر تو برا اثر پڑتا ہی تھا اور کرائم کی موجوں کے پھیلاؤ میں تو اضافہ ہوتا ہی تھا لیکن اس کا سب سے بڑا نقصان جو عوام' حکومت' سیاست اور معاشرے کو ہوتا تھا وہ مالی نقصان تھا۔ لاکھوں کروڑوں بلکہ اربوں ڈالر ایسے ملکوں میں پہنچ جاتے تھے جن کی حیثیت عرفی دو ٹکے کی بھی نہیں تھی۔ اور وہ تیل پیدا کرنے والے ملکوں کے مقابلے میں فارن ایکسچینج کما رہے تھے۔ اصل میں یہ نقصان سب سے بڑا نقصان تھا۔ جو یہاں کسی سے برداشت نہیں ہوتا تھا۔

جوڈی نے کہا "میں تو تمہارے ساتھ کیسینگی جا نہیں سکتی البتہ میری جگہ بوب تمہارے

ساتھ جائے گا اور وہی تمہارا میزبان ہو گا۔

شبیر نے ہنس کر کہا "جوڈی مجھے تمہاری کچھ ایسی عادت پڑ گئی ہے۔ کہ اب تمہارے قائم مقام کے ساتھ میرا گزارا نہیں ہو سکتا۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ تم تین چار دنوں کے لئے چلی چلو اور ہم جلدی واپس آ جائیں۔ میں اپنا پروگرام کٹ شارٹ کر لوں گا"

"لیکن۔۔۔۔!" جوڈی نے ذرا رک کر کہا" تم کو لوئی ویل جانے کی ایسی کونسی مصیبت آ پڑی ہے جو تم ضروری وہاں جانا چاہتے ہو۔ وہ بھی دوسرے امریکی شہروں کی طرح ایک عام سا شہر ہے پھر تم وہاں جانے کے لئے ایسے بے چین کیوں ہو؟"

شبیر نے کہا "بڑے سال ہوئے میرا ایک چچا ملٹری ٹریننگ کے لئے لوئی ویل آیا تھا۔ وہ ہماری آرمی کا سب سے کڑا جوان اور ہمارے گھرانے کا سب سے خوبصورت فرد تھا۔ اس کی چال میں ایسا ردم تھا کہ آواز کے بغیر اس کی چاپ میں کئی گتیں بجتی تھیں۔ میری دادی کو وہم تھا کہ اگر وہ بھی سمندر پار چلا گیا تو پھر واپس نہیں آئے گا میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ "

"وہ ابھی تک یہیں ہے۔ کن گلی میں؟" جوڈی نے چیخ کر کہا۔

" دراصل وہ لوئی ویل بوروی کی ایک لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو کر ملٹری ٹریننگ چھوڑ کر کریسٹ ووڈ میں روپوش ہو گیا تھا۔ اس نے ہم کو وہاں سے تین خط بھی لکھے تھے لیکن اس نے اپنا ایڈریس نہیں دیا تھا۔ لیکن جب اس کی ڈھنڈیا پڑی اور ٹریس ہو جانے کے بعد دونوں حکومتوں نے اس پر واپس پاکستان جانے کا پریشر ڈالا تو اس نے سرکاری پستول سے خود کشی کر لی اور اس لڑکی نے میرے چچا کی میت کو پاکستان نہیں جانے دیا"

" وہ اس سے اس قدر محبت کرتی تھی!" جوڈی نے خوفزدہ ہو کر پوچھا تو شبیر نے کہا "اس کی خود کشی کے ٹھیک ایک گھنٹہ بعد وہ اس کی محبت میں مبتلا ہوئی اور ضد کر کے کھڑی ہو گئی کہ میں اسے پاکستان نہیں جانے دوں گی۔ پہلے تو وہ اس سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔ پھر وہ اس کی ہو کر رہ گئی اور آج بھی ہر صبح اس کی قبر پر پھول چڑھانے جاتی ہے"

"تم اس سے ملنا چاہتے ہو؟" جوڈی نے پوچھا "اپنے چچا کی محبوبہ سے"

"پتہ نہیں" شبیر نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "میں اس کا شہر ضرور دیکھنا چاہتا ہوں"

"ٹھیک ہے" جوڈی نے کہا "میں تمہارے ساتھ چلوں گی"

جب وہ دونوں لوئی ویل کے گرے ہاونڈ کے اڈے پر اترے تو شبیر نے اپنے چچا کے اس مرگناک شہر میں ایک عجیب سی خوشبو کو محسوس کیا۔ یہ خوشبو امریکا کے دوسرے شہروں کی خوشبو سے بالکل مختلف تھی۔ اس میں غزل کے شمشیر بکف محبوب کے حنائی ہاتھوں اور پرانے حمام تلے کچھی

لکڑیوں کے دھوئیں سے ہوئے در و دیوار کی ملی جلی باس تھی۔
جوڈی نے کہا "اس علاقے کی وسکی بہت مشہور ہے۔ اس کی تیز خوشبو سے ہی نشہ ہو جاتا ہے۔ پرانے بڈھے اپنی ٹائی اور مونچھیں اس خوشبو سے لتھیڑ کے رکھتے ہیں۔ پیو گے؟"
شبیر نے اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر نفی میں سر ہلایا تو جوڈی اس اشارت کا مطلب نہ سمجھ سکی۔
اگلے دن شبیر نے بڑے بڑے ٹریکٹروں پر وسکی کے ڈبوں کو بوریوں سے ایئرپورٹوں اور موٹروں کے اڈوں کی طرف جاتے دیکھا۔ بالسا لکڑی کے ہلکے، خوبصورت اور نرم بدن کے ڈبوں میں چھ چھ بوتلیں بند تھیں۔ ڈبوں کو سیدھا رکھنے کے لئے ان پر شراب کے جاموں، کھلی چھتریوں اور کھڑے تیروں کے نشان تھے۔ "دس سائیڈ اپ" کے نیچے کن ٹکی وسکی جرمن حروف میں لکھی تھی۔ ہر بکسے کے پہلوؤں میں لچکیلی پٹ سن کے ہینڈل تھے اور ہر بکسے کی تقدیس برقرار رکھنے کے لئے اس پر جھلی نما مضبوط کاغذ چڑھا ہوا تھا۔
وسکی کا اصل وطن تو سکاٹ لینڈ ہے لیکن امریکا نے بھی اس کی تیاری میں وہ کمال اور ذائقے میں ندرت حاصل کر لی ہے کہ اب امریکن وسکی کی ایکسپورٹ دوسرے سارے وسکی ساز ملکوں سے کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ اس ایک پراڈکٹ کی سیل سے دنیا بھر کی کرنسیوں کی منہ بند بوریاں امریکی بنکوں کے سٹرونگ روموں میں چھتوں تک پہنچ جاتی ہیں۔ وسکی کی برآمد اور کرنسیوں کی درآمد امریکی سٹاک ایکسچینج کے لئے رگ حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ اور اس اکیلے آئٹم نے امریکہ کی معیشت کو تگڑا سہارا دے رکھا ہے۔ ہر سٹیٹ کی اپنی اپنی سینکڑوں بھوریاں اور بیسیوں شراب ساز فیکٹریاں ہیں جن میں ہزاروں مرد عورتیں دن رات کام کرتے ہیں اور اپنی ملکی ضرورت پوری کرنے کے ساتھ ساتھ بے پناہ زرمبادلہ کماتے ہیں۔ ساؤتھ امریکن ممالک کے کچھ ماہرین اقتصادیات کا اندازہ ہے کہ امریکہ جس قدر دولت ہتھیار بیچ کر کماتا ہے کچھ اس قدر دھن شراب اور الکحول کی فروخت سے بھی اکٹھا کرتا ہے لیکن اپنے اس بیان کی تصدیق میں ماہرین اقتصادیات نے کوئی خاص اعداد و شمار فراہم نہیں کئے اس لئے ان کی بات پر سو فیصد یقین کرنا کافی مشکل بات ہے۔
شبیر الٹی سیدھی، ٹیڑھی میڑھی اور کڑوی کسیلی باتیں سوچتے سوچتے گہری نیند سو گیا اور ایسی خوبصورت، رنگدار اور گل و گلزار وادیوں میں اتر گیا جن کی تصویریں نیشنل جیوگرافک میگزین، کاسموپالیٹن، ووگ، شی، میں چھپا کرتی ہیں اور جن کے درختوں، جھاڑیوں، ٹیلوں اور جھیلوں کے آس پاس اپنے اپنے قومی لباس میں وہ ماڈلز بھی ہاتھ ہلایا کرتی ہیں جو لباس کے بغیر چلے ہوائے کے

اندرونی ڈبل بیج پر کوڈا اٹھا کے لیٹا کرتی ہیں۔ شبیر لڑکیوں کے رین ایسے اکڑے ہوئے پیراشوٹ میں لٹک کر ان وادیوں کے درمیان اتر رہا تھا اور ہر وادی پر اس کے پیرا شوٹ کا رنگ بدل جاتا تھا۔ اس نے آج تک جتنے بھی خواب دیکھے تھے عموماً سب بلیک اینڈ وائٹ یا سیپائرن کے ہوتے تھے لیکن لوئی ویل کے اس ہوٹل کی تیرھویں منزل میں آنے والے شبیر کے سارے خواب ٹیکنیکلر ہو گئے تھے اور ہر رنگ عجیب قسم کی براق روشنیاں چھوڑنے لگا تھا۔

ہر خواب میں وہ اوپر ہی اوپر اڑتا تھا اور من ترنگ آنے پر اپنی مرضی کی گھومن گھیریاں بھی ڈالنے لگ جاتا تھا۔ پھر وہ ایک لمبے جھکورے کے ساتھ نیچے آتا اور وادی کی ٹھنڈی ٹھنڈی گھاس پر دونوں پاؤں کنال بھر لمبے رقبے پر رگڑتا پھر اوپر کو چڑھ جاتا۔ نیچے اترنے اور اوپر چڑھنے میں ایک سا لطف تھا۔ نیچے اترنے میں ایک ٹھنڈی ٹھنڈی سنسنی تھی اور اوپر چڑھنے میں ایک جھنجھنی سی تھی جو بار بار پیچھے کو دھکیل رہی تھی۔ لیکن نیچے اترنے اور اوپر چڑھنے میں ایک سا لطف تھا!

ایک مرتبہ جب وہ اپنی گھومن گھیر چراِئی میں نیچے اترا تو پھر نیچے ہی رہ گیا۔ اس نے بڑا زور لگایا۔ اچھلا' کودا' اوپر کا طرارہ بھرا لیکن زمین نے اس کے قدم نہ چھوڑے۔ وہ مایوسی کے عالم میں چلتا چلتا ایک ٹیلے کی اوٹ میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ وہاں تیز دھوپ کے ایک محدب ہالے نے گھیرا تو ساتھ کی ایک ٹھنڈی گپھا میں جا کھڑا ہوا۔ قریب ہی ایک ریڈووڈ درخت کا ڈالا ٹوٹ کر گپھا کے منہ پر گرا تو اس نے اندر اور ٹھنڈک پیدا کر دی۔ ٹھنڈک تو ٹھیک پیدا کر دی لیکن باہر نکلنے کا راستہ مسدود ہو گیا!

جوڈی نے کہا "آج تم مجھے کچھ ڈسٹربڈ سے دکھائی دیتے ہو۔ کیا بات ہے؟ رات سوئے نہیں ؟"

"سویا تو ٹھیک" شبیر نے سوچتے ہوئے کہا "لیکن سوتے میں ڈسٹرب ہو گیا"

"وہ کیسے" جوڈی نے شرارت سے پوچھا "جیسے تم لوگ سو جایا کرتے ہو۔"

"نہیں نہیں' ویسے نہیں" شبیر نے سنجیدگی سے کہا "کچھ الٹے سیدھے خواب آتے رہے۔ کچھ اڑتا رہا' کچھ گرتا رہا اور پھر ایسا گرا کہ اٹھ نہ سکا"

"دی فال" جوڈی نے بے اعتنائی سے کہا "ہمارا پرانا ازلی گناہ"

" اور اس ازلی گناہ سے نکلنے کے لئے انسانیت کو نشے سے نکلنا ہو گا۔ قمار بازی اور سود سے نکلنا ہو گا اور سب سے آخر اس گناہ سے نکلنا ہو گا جو تم لوگوں میں بہت ہی عام ہے اور جسے تم نے جبلت کا سہارا دے کر بہت ہی مضبوط بنیادوں پر اٹھا دیا ہے"

"جوڈی نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا "اسے کچھ نہ کہنا۔ اس جبلی سہارے میں تو میری جان ہے۔ وہ نہ رہا تو پھر یہ ساری زندگی کس کام کی۔"

شبیر نے چند ثانیوں کے لئے اسے غور سے دیکھا اور پھر ہنس کر کہنے لگا "اس میں کسی نہ کسی حد تک ہم سب کی جان ہے اس لئے میں بھی اس کے درپے نہیں ہوں لیکن میرا مد مخالف تو صرف نشہ ہے اور میں اس کی بیخ کنی کے لئے اس دنیا میں بھیجا گیا ہوں۔"

"نشہ مت کہو شبیر" جوڈی نے سکول ٹیچر کی طرح انگلی اٹھا کر کہا' ڈرگ کہو' ڈرگ ہیروئن' پوڈر' ہمارا جہاد ڈرگ کے خلاف ہے' نشے کے خلاف نہیں۔ نشہ تو دولت کا بھی ہوتا ہے' طاقت کا بھی' علم و دانش کا بھی......"

"حسن و جوانی اور رعنائی کا بھی" شبیر نے بات کاٹ کر کہا اور اس کے نرخرے سے کھسکتی ہوئی سیدھی انگلی چلا کر اس کی ناف تک لے گیا اور پھر بڑے سبھاؤ کے ساتھ کہنے لگا' تمہاری لفٹ سائیڈ تمہاری رائٹ سائیڈ سے بھی خوبصورت ہے......... زیادہ راونڈ اور زیادہ ساؤنڈ.............."

"اسی لئے لوگ مجھے لیفٹیننٹ کہتے ہیں اور مجھے ان کی یہ سٹیٹمنٹ بہت اچھی لگتی ہے"

"لفٹیننٹ مرنے کا بھی ایک نشہ ہے" شبیر نے کہا

"کیا تم اس کے بھی خلاف ہو" جوڈی نے پوچھا تو شبیر نے سر ہلا کر کہا" کہہ تو دیا کہ میں ہر طرح کے نشے کے خلاف ہوں اور مجھے اس کا قلع قمع کرنے کے لئے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ اسی لئے تو میں تمہارے ملک کا ساتھ دے رہا ہوں کہ یہ بھی ڈرگ' ہیروئن' مریکوانا اور نشے کے خلاف جہاد کر رہا ہے اور انسانیت کو اسفل السافلین کی ذلت سے نکال کر واپس احسن التقویم کے پیڈسٹل پر رکھنے کا خواہشمند ہے" پھر وہ رک گیا اور غور سے جوڈی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا میں امریکا سے اتنی محبت کرتا ہوں کہ یہاں کے رہنے والے بشمول تمہارے اور تمہارے سارے خاندان کے اس ملک سے اتنی محبت کا دعویٰ نہیں کر سکتے"

جوڈی اپنے دونوں کنگھی ڈالے ہاتھ گود میں رکھ کر بڑی دیر تک شبیر کو پیار سے تکتی رہی اور پھر وہ اوہایو دریا پر ہائیڈرو الیکٹرک ڈیم کی سیر کو نکل گئے۔

اور پھر پتہ نہیں کیا ہوا' کیسے ہوا اور کب ہوا کہ جوڈی کو اطلاع دیئے بغیر شبیر اپنے ہوٹل سے چیک آؤٹ کر گیا۔ اور کروٹنگن جانے والی بس پر سوار ہو کر اوپر کو نکل گیا۔ وہ چند روز کسی کی نگہداری اور ہمدمی کے بغیر اپنے محبوب ملک کی سیر کرنی چاہتا تھا اور لمبے لمبے راستوں میں لمبے لمبے

طرارے بھرنے کی آرزو میں مٹا جا رہا تھا۔ اس نے بس کی کھڑکی سے اپنی حریص نگاہیں گھاس کے میدانوں اور مکئی کے وسیع و عریض بارانی رقبوں پر کاہی کی طرح چپکی ہوئی تھیں اور وہ بے صبری کے ساتھ بھری پری فصلوں کو سمیٹتا جا رہا تھا۔ مکئی کے کھیتوں کے کنارے "کینیگی بوریوی و مسکی" کے بڑے بڑے بورڈ لگے تھے جن پر لکھا تھا کہ یہ کھڑی فصل بروری نے اپنی آئندہ کی وسکی کھیپ کے لئے مخصوص کر لی ہے۔ غیر قانونی طور پر ان کھیتوں میں داخلہ ممنوع ہے۔

آگے ایک چھوٹے سے ہالٹ ٹربل پر گرے ہاونڈ پانچ منٹ کے لئے رکی تو شبیر اسی جگہ اتر گیا حالانکہ۔ اس کو لگنٹن شہر جانا تھا جہاں اعلیٰ نسل کے تھارو بریڈ گھوڑوں کی نسل کشی کا ایک مشہور اصطبل تھا جہاں سرگودھا کے دو نیزہ باز صفدر علی اور دلبر حسین ایک عرصہ سے یہاں سانڈ گھوڑا چھوڑنے پر ملازم تھے۔ اس اصطبل میں مصنوعی نسل کشی کا طریقہ رائج نہیں تھا۔ پرانے قدرتی طریق پر بچہ لیا جاتا تھا!

ٹربل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس کی آبادی مشکل سے پانچ سو نفوس پر مشتمل تھی۔ دور دور تک پھیلے بڑے بڑے گھر تھے اور ان کو ملانے والے راستے زیادہ کھلے نہیں تھے۔ گھروں کے باہر بالکل کھلے ہیں پیلے رنگ کے ٹریکٹر اور تھریشر بھی تھے اور اونچے اونچے جنگروں تلے قدیم وضع کے ڈسک ہیرو ہل پرانے مسائے اور دو گھوڑوں والے چھکڑے بھی پڑے تھے۔

شبیر سارا دن اس گاؤں کا جائزہ لیتا رہا اور کھیتوں کو ملانے والے انجانے رستوں پر بلا مقصد گھومتا رہا۔ شام کے وقت اس نے ٹربل بس سٹینڈ پر واپس آکر کیسکی چکن اور آئی ڈامو پٹاٹو کا ڈنر کیا۔ دو ٹن ٹھنڈا پیپسی پیا۔ ایک ڈبیا سگرٹ تین ڈبیا ماچس ایک تھیلی ٹوئی فروٹی کینڈی اور ایک عدد چھوٹا ٹینس لز خریدا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں سے دو چار رسمی اور ایک آدھ موسمی بات کر کے وہ نیچے اترتی ہوئی شام سے آگے بڑھ کر ملاقات کرنے کو بہت دور سنسان کھیتوں کی طرف نکل گیا۔

رات تاریک تھی۔ سوکھی گھاس کے قطعوں میں خوفناک سرسراہٹ پیدا ہو چکی تھی۔ مکئی کے کھیتوں میں ادھ سوکھے ٹانڈے اپنے قدموں پر مضبوطی سے کھڑے تھے اور ان کے سینے سے لگے ہوئے بھٹے گہری نیند سو چکے تھے۔ جھینگر' ڈڈے اور بینڈے پنچم کا ایک سر پکڑ کر بلند سے بلند تر ہوتے جا رہے تھے۔ قریبی درختوں سے بڈھے الو گھاس کنارے کھیلتے چپ منک کے بچوں کو اٹھا اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ گیدڑوں نے بولنا شروع کر دیا تھا لیکن وہ جگہ جگہ لگے پھندوں سے ڈر کر کھیتوں میں داخل ہونے سے گھبرا رہے تھے۔ میلوں تک پھیلا ہوا سناٹا ایک طرف تھا اور اکیلا شبیر دوسری

طرف۔

اس نے گہری سرمئی رات میں سگرٹ نکال کر ہونٹوں میں دبایا۔ جیب سے ماچس نکالا اور اپنے قریبی سوکھی گھاس کے قطعے کو آگ لگا دی۔ ایک قریبی بھبھوکے پر اپنے منہ کا بے جلا سگریٹ پھینک کر وہ آگے کو بھاگا تو گھاس کا سارا تپڑ ایسے روشن ہو گیا جیسے اس کی سطح پر پٹرول کا چھڑکاؤ ہوا ہو۔ شبیر نے خوشی کا ایک زور دار نعرہ مارا جو اس کے منہ سے نکلتے ہی بے معنی ہو گیا کہ اس میں الفاظ نہیں تھے صرف صوتی تاثر تھا جو آڑے چوتالے کی باج پر نکل گیا تھا۔

شبیر نے قریبی مکئی کے کھیت کو نذر آتش کرنے کے لئے ماچس جلائی تو پوری تیلی بغیر کچھ کئے اس کی چٹکی میں ہی ختم ہو گئی۔ ٹانڈہ ابھی پورے طور پر سوکھا نہیں تھا اور اس میں کچھ نمی باقی تھی۔ لیکن جب بھڑ بھڑ جلتے گھاس کے قطعے کے لانبو مکئی کے کھیت کی طرف لپکے تو پہلے انہوں نے ٹانڈوں کو اپنی حدت سے خشک کیا اور پھر انہیں اپنی آتش عطا کر دی۔

گھاس کی آگ میں اتنی روشنی نہیں ہوتی جس قدر چاندنا بار ور فصل کے جلنے میں ہوتا ہے۔ اس میں پودا اور پھل دونوں اپنی اپنی روشنی دیتے ہیں اور دونوں کی روشنی جدا جدا ہوتی ہے یہ جب مکئی کے چار بڑے رقبے ایک ساتھ روشن ہوئے تو شبیر نے نگاہیں اٹھا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ مکئی کی کھڑی فصل کے بھڑ بھڑ جلنے سے آدھا آسمان روشن ہو گیا تھا۔ پوست کی فصل جلاتے ہوئے اس نے بیلی کا پٹر کی اونچی اڑان سے نیچے زمین کی طرف دیکھا تھا تو آتش گیر گرنیڈوں نے لالے کے پھولوں کو جلا کر ایسا دھواں اٹھایا تھا کہ سامنے کا آدھا پہاڑ دھواں دھار ہو گیا تھا۔ چونکہ ساری فصل کچی تھی اور آتشیں مادہ اسے جلنے پر مجبور کر رہا تھا۔ اس لئے سبز پوست کی ساری آگ تاریک دل اور تاریک خیال سی ہو گئی تھی اور نیچے کھڑے پٹھان بابا کا کسان کنبہ اونچے اڑتے ہوئے بیلی کوپٹر کو پتھر اٹھا اٹھا کر مار رہا تھا اور "کوا بدبختا... کوا "حرام زادیا" کر رہا تھا۔

لیکن کینٹکی ریاست کے قصبہ ٹربل کی مکئی کی فصل بڑی طاقت ور اور خوب مسکی ہوئی تھی۔ خالی جینز شرٹ پہنے تو کوئی بھی شخص ان کھیتوں میں سے بآسانی گزر سکتا تھا لیکن اگر اس نے کہیں بھی بکل ماری ہوتی تو پھر اس کھیت میں سے گزرنے پر دائیں بائیں کے ہر ٹانڈے کو ہلنا ضرور تھا۔ بڑے ہی گھنے کھیت تھے اور بہت ہی بھرپور فصل تھی اور خود بخود لپکنے اور لپکنے والی آگ تھی کہ لمبائی اور چوڑائی دونوں جانب ایک سی بھاگ رہی تھی۔

"جب کھیتوں کے کناروں پر "کینٹکی بوربون وسکی" کے اجارے والے بڑے بڑے آہنی بورڈ جل جل کر دسہرے کی طرح اپنے ہی پاؤں میں گرنے لگے تو شبیر نے زور کا ایک نعرہ مارا "مرگ

بر سکر مرگ برخمار" پھر وہ پھیلتی ہوئی آگ کے کنارے کنارے مناسب فاصلہ چھوڑ کر بھاگنے لگا اور اونچے اونچے للکارے مارنے لگا "سن لو بدبخت نشہ بازو! بدمست خراباتیو! اس مرتبہ تمہیں اس لعنت کا ایک گھونٹ بھی نہیں ملے گا۔ اب تم ساری زندگی ترستے رہو گے اور ساری عمر تڑپتے رہو گے اور مے خوارں کی پھنکار اور بادہ نوشی کی ملامت کو گلے نہ لگا سکو گے..... تم نے آج تک نہ خدا کا حکم مانا اور نہ حفظان صحت کے اصولوں کو اپنایا اور نہ اخلاقی قدروں کو اپنی زندگی کا سہارا بنایا لیکن آج کے بعد سے تم اس لعنت کے اسیر نہیں رہو گے کہ ہم نے دنیا کے گوشے گوشے میں اس اس کے ہر منبع اور ماخذ کو تہس نہس کرنے کا کام شروع کر دیا اور نشے کی جڑ بنیاد کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے....... آؤ ہمارا ساتھ دو...... ہمارے ہاتھ میں ہاتھ دو...... اور اس ہاتھ کو مضبوط کرو جو نشے کی جڑ کاٹ رہا ہے۔ خمر کی بنیاد ڈھا رہا ہے اور سکر کے خلاف جہاد کر رہا ہے"

شبیر آگ کے پھیلتے ہوئے رقبوں پر کنارے کنارے کراس کنٹری بھاگ رہا تھا۔ اور اپنے آگے پیچھے ایک سے زور کی تالیاں بجا کر بہت ہی اونچی بلکہ بے حد اونچی آواز میں قوالی کی دھن میں گا رہا تھا " آگ ہے' اولاد ابراہیم ہے' نمرود ہے' کیا کسی کو' پھر کسی کا امتحان مقصود ہے۔ کیا کسی کو پھر کسی کا.....! کیا کسی کو پھر کسی کا...... کیا کسی کو پھر کسی کا!!!! امتحان مقصود ہے!"

بھاگتے بھاگتے' گاتے گاتے اور تالیاں بجاتے بجاتے شبیر باولا سا ہو گیا' اس نے دیکھا آسمان میں بہت سارے ہوائی جہاز' ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو پرواز کرتے جلتے ہوئے کھیتوں پر پانی کی بوچھاڑ کرنے آ گئے ہیں! اسی قسم کے اور اسی ماڈل کا ہوائی جہاز علاقہ غیر میں پوست کے کھیتوں پر آگ برسانے آئے تھے جن کا گائیڈ شبیر تھا۔

دوسرے دن شبیر نے ایک عجیب بات نوٹ کی کہ امریکا میں جب کسی ملزم یا مشتبہ کو ہتھکڑی لگاتے ہیں تو اس کی دونوں کلائیوں میں ہتھکڑی نہیں ڈالتے بلکہ اس کا ایک حلقہ ملزم کی کلائی میں ڈال کر دوسرا حلقہ تفتیشی آفیسر اپنی کلائی میں ڈال کے آنکڑا بند کر لیتا ہے اور چابی جیب میں ڈال لیتا ہے۔ ملزم اور پولیس آفیسر ایک ہی ہتھکڑی میں بندھے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

شبیر نے اپنے ساتھ چلتے ہوئے ہتھکڑی بند آفیسر سے پوچھا "کیا وقت ہو گا" تو اس نے ہنس کر کہا "ایسے موقعوں پر ہم گھڑی نہیں باندھتے صرف ہتھکڑی ہی لگا کے رکھتے ہیں۔"

(معاصر لاہور شمارہ۔۴)

گاتو

وہ زیر تعمیر بنگلے کی ان ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا تھا جنھیں لمبی دستیوں والی چھوٹی چھوٹی ہتھوڑیوں سے توڑ کر روڑی میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ پھر ان کنکریوں میں سیمنٹ اور راکھ ملا کر بنیادوں میں ڈالتے ہیں اور اوپر عمارت اٹھاتے ہیں۔

زیر تعمیر بنگلے کے نامکمل ستونوں سے لوہے کی سلاخیں اوپر کو نکلی تھیں اور مسلسل بارشوں سے ان کا رنگ سیندوری ہو گیا تھا۔ اردگرد کی کوٹھیوں میں رہنے والے لونڈوں نے رسیوں کے پھندے پھینک پھینک کر دو تین سلاخوں کو اس طرح دوہرا کر دیا تھا کہ ان کے سرے چیل پایوں کے قدموں تک پہنچ گئے تھے۔ قد آدم اٹھی دیواروں سے خانساماں لوگ اینٹیں اکھاڑ کر باورچی خانے میں نئے چولہے بنانے کے لیے لے آئے تھے، اور آہستہ آہستہ یہ بنگلہ کھنڈر بنتا جا رہا تھا۔

اسی بنگلے کے پہلو پر عارفہ اور صدیقہ کے کمرے کی کھڑکیاں کھلتی تھیں جن پر پیاز کے پرت ایسے نائیلون کے پردے پڑے تھے۔ یہ دونوں بہنیں کاسنی دوپٹے اوڑھ کر سکول جایا کرتی تھیں اور شام کو ایک دوسرے کے کندھے کا سہارا لے کر لباس تبدیل کیا کرتی تھیں۔ پرے یزدانی صاحب کی کوٹھی پر اور برساتی میں ان کا سب سے چھوٹا لڑکا انور رہتا تھا جو دوسری مرتبہ میٹرک کا امتحان دے رہا تھا اور غسل خانے سے اپنے ابّا جان کے بلیڈ چرایا کرتا تھا۔ اس بنگلے کی پشت پر بڑی سی کریم کلر کوٹھی میں ایک امریکی جوڑا رہتا تھا جو بالائی منزل کے سپاٹ چھجے پر چھوٹا سا تولیہ بچھا کر دھوپ سینکا کرتا تھا۔

بیگم نیاز نے اپنے بیڈروم کے سنگار میز سے سرخ ربن اٹھا کر رنگ ماسٹر کی طرح جھٹکا اور اپنے پھولے ہوئے بالوں میں باندھ لیا۔ پھر سفید ڈوری کے سرے پر لگی پنگ پانگ کی گیند کھینچی اور لوہے کے فریم میں جڑے ہوئے اڑتالیس شیشوں والے دریچے سے ویل ویٹ کے پردے ادھر ادھر ہٹ گئے۔

دریچے کے عین سامنے وہ زیر تعمیر بنگلے کی ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کے ڈھیر پر بیٹھا تھا۔ بیگم نیاز نے نفرت سے بھویں سکیڑ کر دوسری گیند کھینچی اور پردہ اپنی جگہ پر آگیا۔ غصے سے دانت پیس کر وہ سنگھار میز کے اسٹول پر بیٹھ گئیں اور روکھی ہو کر بولیں، "توبہ رذیلوں کی اولاد کس قدر ضدی اور اڑیل ہوتی ہے۔ جو کچھ ماں باپ سکھادیں کیا مجال جو رتی بھر بھی ادھر سے ادھر سرک جائیں۔ صبح صبح پھر آکر بیٹھ گیا۔ حرامزادہ۔"

مسٹر نیاز اپنی بیگم کو خوش کرنے کے لیے مسکرائے اور لیٹے لیٹے تکیے کے نیچے ہاتھ پھیر کر سگریٹ تلاش کرنے لگے۔ بیگم نے منہ بنا کر کہا، "آپ سے اتنا بھی تو نہیں ہو سکتا کہ اس کے باپ کو بلا کر دھمکائیں اور اسے اپنا رویہ ٹھیک کرنے کو کہیں۔ آپ نے تو ماتحتوں کو سر چڑھا لیا ہے۔"
مسٹر نیاز نے دیاسلائی کو پھونک مار کر بجھادیا اور اپنے سگریٹ کا تازہ تازہ سلگا ہوا گل دیکھ کر بولے، "وہی ہوگا حضور، جو آپ فرمارہے ہیں۔ جناب نے دھمکانے کو کہا ہے میں اسے ٹرانسفر ہی کردوں گا۔" بیگم نے ربن کو چٹکی میں پکڑ کر کھینچا اور زمین پر پھینک دیا ان کے پھولے ہوئے بال کاندھوں پر آگرے۔ مسٹر نیاز نے اپنے موٹے ہونٹ کی پتلی سی پپڑی نوچتے ہوئے کہا، "سرکار کے تیور کچھ کڑے پڑتے ہیں کہیں ہمیں نہ مارے جائیں بیگم صاحبہ اس بات پر بھنا کر بولیں، "کل شام اس فتنہ نے جو مجھ سے کی ہے خدا کرے تمہارے ساتھ ہوتی پھر آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوتا۔ وہ تو میرا جی تھا جو چپکی ہو رہی ورنہ اس حرامی پر تو پلوٹو چھوڑ دیتی۔ قیمہ ہی باندھ کے لے جاتے گھر والے۔"

مسٹر نیاز نے کہنیوں کے بل ہو کر سر پیچھے ڈال دیا اور سگریٹ چھوڑتے ہوئے بولے، "گھبرایئے نہیں، میں اس کے باپ کی آج ہی جواب طلبی کروں گا اور اس کی تبدیلی کے آرڈر نکال کر آج شام ہی بستر گول کروادوں گا۔"

"اور اگر آپ نے تبدیلی نہ کی تو؟" بیگم نے بیگمانہ انداز میں پوچھا۔

"تو آپ ہمیں اپنے گھر نہ گھسنے دیجیے گا۔"

بیگم نے زمین پر گرا ہوا ربن پھر اٹھالیا۔

قیوم کے ابا دفتر میں نوکر تھے۔ وہ صبح پتلون کو گک کلپ لگا کر بائیسکل پر دفتر جاتے اور شام کو تھیلا لے کر پیدل سبزی لینے جاتے۔ کبھی قیوم بھی ان کے ساتھ جاتا۔ خوانچے والوں کو دیکھ کر رک جاتا۔ کبھی کہتا مجھے یہ لے دو۔ کبھی کہتا وہ لے دو۔ اس کے ابا بہت ناراض ہوتے۔ کبھی جھڑکتے،

کبھی ہاتھ پکڑ کر کھینچتے۔ گھر پہنچ کر اس کی ماں سے کہتے، دوبارہ میں قیوی کو ساتھ نہ لے جاؤں گا۔ یہ بہت تنگ کرتا ہے۔ راستے میں رک رک جاتا ہے۔

قیوی کی امّی کہتی: اچھے بچے یوں نہیں کیا کرتے۔ بڑوں کا کہا مانتے ہیں۔ جس طرح وہ کہتے ہیں اسی طرح کرتے ہیں۔ دیکھو تو اسد کس طرح اپنے ماں باپ کا کہا مانتا ہے۔ سبھی اس سے پیار کرتے ہیں۔ ہر ایک اسے اچھا سمجھتا ہے۔

قیوی نے کہا اس کے ابّا نے تو اسے طوطا لا کر دیا ہے۔ میرے پاس کوئی طوطا ہے؟ اس نے کہا: تُو طوطا لے کر کیا کرے گا۔ غصّہ میں آئے گا تو انگلی کتر ڈالے گا۔ ذرا پنجرہ کھلا رہ جائے گا تو پُھر سے اڑ جائے گا۔ قیوی نے کہا پھر مجھے ایک چھوٹا سا کتا لے دو جیسا جمی کے پاس ہے۔ اس کی امّی بولیں: ہم کتا کہاں رکھیں گے۔ جمی تو کوٹھی میں رہتا ہے۔ ان کے کئی نوکر ہیں، وہ ہر چیز کی دیکھ بھال کرتے ہیں، ہم کتا کیسے پال سکیں گے؟ قیوم نے جواب دیا: میں کتے کو زنجیر سے باندھ دوں گا۔ آدھا دودھ اس کو پلاؤں گا، آدھا خود پیوں گا۔ سکول سے آکر سیر کرانے لے جاؤں گا۔ جب بڑا ہو جائے گا تو چوروں کو مارا کرے گا۔ قیوم کی امّی نے کہا "بیٹا کتا چوبارے پر نہیں رہ سکتا۔ برتنوں میں منہ ڈالتا ہے۔ غصّہ میں آجائے تو بوٹی نکال لیتا ہے۔ اڑوس پڑوس کی مرغی پکڑ لے تو پیسے بھرنے پڑ جاتے ہیں۔ تُو کتا لے کر کیا کرے گا؟ قیوم نے کہا: پھر مجھے بلّی لے دو۔ میں اس کے گلے میں.....

اس کے باپ نے جھڑک کر کہا "بکواس بند کرے گا کہ نہیں بلّی کا بچہ؟" قیوم سہم کر دیوار سے لگ گیا۔

قیوم کے ماموں انڈونیشیا میں رہتے تھے۔ پہلے وہ کراچی رہا کرتے تھے۔ پھر ان کی بدلی انڈونیشیا میں ہو گئی۔ جھٹ پٹ شادی کرا کے ماموں انڈونیشیا پہنچ گئے۔ قیوم کے ابّا شام کو نیچے اتر کر جلد ساز کے پاس جا بیٹھتے۔ حقہ پیتے۔ انڈونیشیا کی باتیں کرتے: کالی مرچ وہاں دو آنے سیر بکتی ہے، زیرہ ایک آنہ سیر، گوشت چونّی کا آدھا سیر، پھل ایک روپے کا ٹوکرا بھر۔ قیوم کی امّی پڑوسن سے کہتیں: انڈونیشیا سے بھائی کا خط آیا ہے۔ بنگلے میں رہتا ہے۔ پانچ نوکر ہیں۔ اگلے مہینے کار خریدے گا۔ آتا ہوا ساتھ لائے گا۔ دو ریڈیو خریدے ہیں۔ ایک میرے لیے دوسرا اپنے لیے۔ بجلی کی مشین بھی لی ہے۔ آپ سے آپ کپڑے سیتی ہے۔ وہاں ہر چیز سستی ہے۔ پچاس ساٹھ میں اچھا گزارا ہو جاتا ہے۔

قیوم نے دونوں کی باتیں سنیں بہت خوش ہوا۔ تالی بجا کر بولا : امی مجھے وہاں سے ایک بلی منگوادو۔ سستی مل جائے گی۔ میں اس کے گلے میں پیلا ربن باندھوں گا۔ دو ٹانگوں پر چلنا سکھاؤں گا۔

امی نے کہا : صدقے جاؤں بلی کیسے آئے گی۔ ماموں کے آنے میں تو دیر ہے۔

قیوم نے کہا : ماموں کو لکھیے۔ وہ ڈبے میں بند کر کے بھیج دیں گے۔ ڈاکیا دے جائے گا۔

قیوم کی امی ہنس پڑیں۔ پیار بھرے لہجے میں بولیں : ڈبے میں بے چاری بھوکی پیاسی مر جائے گی۔ سانس رک جائیگی۔ دم گھٹ جائے گا۔

قیوم نے کہا ماموں کو لکھیے چھیدوں والے ڈبے میں بھیجیں۔ ساتھ ہی دودھ کی بوتل رکھ دیں۔ ماں نے بیٹے کو کلیجے سے لگالیا اور جھلا جھلا کر تھپکنے لگی۔

ایک دن قیوم کے ابّا دفتر سے آئے تو ان کی بیوی نے کپڑے دھونا چھوڑ کر کہا : جی پتہ ہے آج قیوم نے کیا کہا ؟

خواجہ صاحب وہیں رک گئے اور گھبرا کر بولے ، ” کیا ؟ “

بیوی نے کہا میں صدیق بھیا کو خط لکھتی تھی کہ میرے پاس ایک پرچی لکھ کر لے آیا۔ کہنے لگا ماموں کو میرا خط بھی بھیج دو۔ میں نے دیکھا۔ ہائے صدقے جاؤں۔ ایسا پیارا خط لکھا تھا کہ شاید آپ سے بھی نہ لکھا جائے۔ “

” کیوں ؟ “ خواجہ صاحب نے کلپ اتارتے ہوئے پوچھا۔

” لکھا تھا میرے پیارے ماموں جان جی۔ میں آپ کو بہت یاد کرتا ہوں ، جلدی آجائیں۔ میرے لیے ایک بلّی لانا۔ چھوٹی موٹی کی بلّی نہیں ، سچیں مچی کی بلّی۔ بڑے بالوں والی۔ “

یہ کہہ کر خواجہ صاحب کی بیوی ہنسنے لگیں اور خواجہ صاحب ماتھے پر تیوری ڈال کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ان کی بیوی نے کپڑوں کا تھل پرے دھکیل دیا اور خود پیڑھی گھسیٹ کر ان کے پاس پہنچ گئیں۔ خواجہ صاحب نے پوچھا، ” کوئی خط آیا تھا ؟ “

” کوئی نہیں ان کی بیوی نے آٹھویں کی لڑکی ایسا سر ہلا کر جواب دیا اور پھر خواجہ صاحب کے زانو پر دونوں ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں ، ” توبہ اللہ آپ تو بس منہ بجا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ قیومی کی بات سنائی پھر بھی ہنسی نہیں آئی۔ “

خواجہ صاحب نے کہا ، لعنت بھیجو۔ حالات ہی ایسے ہیں۔ ہنسی کیسے آئے۔ “

ان کی بیوی نے کہا، "حالات کو بے شک گولی ماردو پر میرے قیومی کو کچھ نہ کہو۔ منہ بھر کے بات کردیتے ہو۔"

خواجہ صاحب نے کہا، "چپ رہو مریم میں تھکا ہوا ہوں۔"

مریم چپ ہو گئی اور خواجہ صاحب ویسے ہی پتلون پہنے چارپائی پر دراز ہو گئے۔

انڈونیشیا کی پاکستانی ایمبیسی میں اپنی سروس ڈیوریشن ختم کرنے کے بعد جب قیوم کے ماموں واپس پاکستان آئے تو فارن آفس میں چارج لینے کے بعد سیدھے لاہور پہنچے۔ وہ اپنی سسٹر کے لیے بہت سی چیزیں لائے تھے۔ ان میں ریڈیو سیٹ یا سوئنگ مشین وغیرہ تو نہ تھیں، البتہ سر میں پہننے کے پرنٹڈ کپڑے ضرور تھے۔ کچھ وڈن سٹیچو تھے جو وہاں کے فوک ڈانسرز کی مختلف پوزوں پر مشتمل تھے اپنے برادران لا کے لیے وہ سوٹ کا کپڑا لائے تھے اور ایک آئی وری ہینڈل کی خوبصورت سی چھڑی۔ لیکن جب انھوں نے قیوم کا گفٹ دینے کے لیے بوٹ کا ڈبہ کھولا تو اس میں سے ایک چھوٹا سا بلی کا بچہ نکلا۔ جس نے ڈھکنا کھلتے ہی ننھی چھینک ماری اور اپنی کمر محراب بنا کر انگڑائی لی۔ قیوم خوشی سے دیوانہ ہو گیا اور ماموں کی کمر میں باہیں ڈال کر مارک ٹائم کرتے ہوئے ناچنے لگا۔ اس کے ابّا نے جھڑک کر کہا، "گدھا کہیں کا، کیا بے صبرا ہوا ہے۔"

امی بولیں، "بیٹا شور تو نہ کرو۔ ماموں جی غصے ہوں گے۔"

ماموں نے کہا، "یہ بڑی ونڈرفل بلی ہے۔ اسے 'سیامیز کیٹ' کہتے ہیں۔ جکارتا میں ایک کرنل کے پاس تھی۔ میں نے قیوم کا لیٹر پہنچتے ہی ایک بلونگڑا خرید لیا تھا۔ جسٹ سی۔ اس کے کان اور ناک دونوں سیاہ ہیں۔ یہی سیامیز کیٹ کی پہچان ہے۔"

قیومی نے ماموں کی کمر کے پیچھے سے سر نکالا اور بلی کو پیار دینے کے لیے ذرا سا آگے بڑھا۔ بلی نے ایک اور انگڑائی لی اور قیومی سہم کر پیچھے ہٹ گیا۔ سب ہنسنے لگے۔ ماموں نے کہا، "کم آن، کم آن یہ تو تمھاری فرینڈ ہے۔ ہم نے اسے تمھارا نام بتادیا ہے۔ بالکل کچھ نہیں کہے گی۔ پھر انھوں نے بلونگڑے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور اس کے جسم سے خر خر کی آواز نکلنے لگی۔

قیوم کی امی نے کہا، "صدیق ہماری بلیوں کے اندر بھی ایسی آواز ہوتی ہے؟"

"نہیں" خواجہ صاحب نے کہا "ادھر کی بلیاں تو کاٹھ کی بنی ہوتی ہیں۔ ہاتھ پھیرو تو برادہ جھڑتا ہے۔ واہ عقل کی کودن!"

قیوم کے ماموں نے کہا: "سیامہ کیٹ بس ایک ہی بچہ دیتی ہے اس کے بعد ساری لائف

ویسے ہی پاس کر دیتی ہے۔"

"بڑی بر ہم چاری بلی ہے۔" خواجہ صاحب شرارت سے مسکرائے۔

"مریم نے کہا، "ہائے اللہ ایک بچہ صرف! مر جائے تو ماں کا جی ویران ہو جائے۔
ہے نا؟"

خواجہ صاحب نے کہا، "بلی ماں اور عورت ماں میں بڑا فرق ہے۔ بلی کے بچے کو نہ سونے کے سہرے لگتے ہیں نہ اسے ڈپٹی بننا ہوتا ہے۔ اس لیے وہ بچے کو رو دھو کر بھول جاتی ہے۔ عورت ماں کا بچہ مرتا ہے تو اس کے ساتھ ایک دولہا مرتا ہے۔ ایک ڈپٹی مرتا ہے۔ کمائی کا ذریعہ ڈوبتا ہے۔ جب اتنی ساری چیزیں ایک ساتھ فنا ہو جائیں تو کس کا جی ویران نہ ہو گا۔"

صدیق نے کہا، "بھائی جان تو فلسفی ہو گئے۔"

خواجہ صاحب بولے، "اسلام آباد میں رہے گا۔ دو چار بچے ہو جائیں گے۔ پتلون گھس جائے گی تو تیری فلاسفی بھی خود بخود نظر آنے لگے گی۔"

قیوم کی امی چمک کر بولیں، "توبہ میری۔ کسی کی بات کو یوں نہیں تو مروڑا تروڑا کرتے۔"

اس گفتگو میں سارے یہ بھول گئے کہ قیوم ابھی تک ماموں کی کمر سے لپٹا ہوا ہے اور چور آنکھوں سے بلونگڑے کی طرف دیکھ رہا ہے۔ خواجہ صاحب نے کہا، "شاباش شیر پترا۔ تھوڑا اور ماموں کی بغل میں چھپ جا۔"

ماموں نے قیوم کا آرم پکڑ کر سوتیلی اپنی طرف کھینچا اور کہا، "کم آن۔ یہ تو فرینڈلی ہے۔ تم سے تو ماں باپ سے بڑھ کر پیار کرے گی۔ تمھارے لیے لایا ہوں تم نے لیٹر لکھا تھا کہ نہیں؟"

قیوم نے اثبات میں سر ہلایا اور تھوڑا سا باہر نکل آیا۔

"ٹچ اٹ! ٹچ اٹ!!" ماموں نے قیوم کا ہاتھ پکڑ کر بلی کی فر پر پھیرا اور کہا، "کچھ بھی نہیں کہتی نا۔" قیوم نے نفی میں سر ہلایا اور ماموں کے گھٹنے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"اس کا نام ڈیزی ہے ماموں؟" قیوم نے ہولے سے پوچھا۔

اور خواجہ ہنس پڑے۔ "ہاں ڈیزی جیکسن! بڑی حرامزادی تھی۔ ایس پی جالندھر کی میم تھی۔ خانساموں، خاکروبوں کی مومیائی نکال لیتی تھی۔"

"بس بس" مریم نے کہا: "اب اس کی گندی باتیں نہ سنانے لگ جانا۔ ہم تو قیوم کی بلی کا

کوئی اور ہی نام رکھیں گے۔ ہیں نا بھئی قیومی؟"
قیوم نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے ماموں نے مسکراتے ہوئے کہا: "اس کا نام تو گاتو ہے....."
"گاتو ماموں؟" قیوم ایک دم بولا۔
"ہاں" ماموں نے سوچتے ہوئے کہا: "گاتو اناٹلین لینگویج میں بلی کو کہتے ہیں۔"
"بڑا واہیات نام ہے۔" خواجہ صاحب بولے۔
"واہیات نہ واہیات چنگا بھلا ہے۔" مریم نے یقین سے کہا۔
"ہاں امی بڑا اچھا ہے گاتو۔ ہے نا ماموں؟"
"شاباش۔" ماموں نے قیوم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور گاتو کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر قیوم کی طرف بڑھایا۔ قیوم ڈرا، جھجکا، ایک قدم پیچھے ہٹا، پھر اس نے اپنا چہرہ ذرا سا ایک طرف موڑ کر گاتو کو ہاتھوں میں اٹھالیا۔ گاتو نے اپنی دم پچھلی ٹانگوں میں دبالی اور پنجے بغلوں میں چھپا لیے۔ قیوم نے اسے اور قریب کیا تو گاتو نے ہولے سے میاؤں کی آواز نکالی۔ قیوم نے ڈرتے ڈرتے اس کے گلابی ناک پر ہولے سے پھونک ماردی۔ گاتو نے آنکھیں بند کرلیں۔ قیوم کا حوصلہ بندھا اور اس نے بند آنکھوں والی گاتو اپنے گال سے لگالی۔ گاتو خر خر بولنے لگی۔
اب محلے کے بچے قیوم سے کھیلنے لگے۔ کوئی کہتا ذرا سی دیر کو گاتو میری گود میں دو۔ کوئی کہتا ایک منٹ مجھے دو۔ قیوم ہر ایک کو اپنی بلی دے دیتا۔ اس کے دوست گاتو کو گود میں اٹھا کے پیار کرتے۔ اپنے گھروں سے دودھ چرالاتے۔ گاتو کو پلاتے۔ خوش ہوتے۔ قیومی کہتا، میرے ماموں ولایت سے لائے ہیں۔ صاحب سے خریدی ہے سو روپے میں آئی ہے۔ امی نے مجھے ربن دیا ہے۔ صدیق چچا اس کے لیے گھنگرو لائے ہیں۔ ابھی چھوٹی ہے۔ بڑی ہوجائے گی تو چوہے مارے گی۔ شیر سے لڑے گی۔ میرے ساتھ سکول جایا کرے گی۔ اس کے دوست پوچھتے، "جب گاتو بڑی ہوجائے گی پھر بھی تو ہمیں اس سے کھیلنے دیا کرے گا؟ قیومی کہتا اگر تم میرا بستہ اٹھا کر لے جایا کروگے تو کھیلنے دوں گا۔ نہیں تو نہیں۔ سب بچے ایک ساتھ بولتے۔ میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ قیومی خوش ہوکر گاتو کو گلے سے لگاتا۔ اس کا منہ چومتا۔ بلی خر خر کرنے لگتی۔
قیوم کی امی کہتی تُو تو اس بلی کے پیچھے پاگل ہوجائے گا۔ تختی لکھتا ہے تو گود میں بٹھا کر۔ روٹی کھاتا ہے تو ساتھ بٹھا کر۔ سوتا ہے تو گلے سے لگا کر۔ آخر اس میں ہے کیا۔ تجھے اتنی اچھی کیوں

لگتی ہے۔ قیوم کہتا، میری گا تو ہے نا۔ آپ کو کیا۔ جب میں سکول سے آتا ہوں دروازے میں بیٹھی ہوتی ہے۔ سیڑھیوں میں میری آواز سنتی ہے۔ میاؤں میاؤں کرنے لگتی ہے۔ جو میں کہتا ہوں وہی کرتی ہے۔ میں اسے کہانیاں سناتا ہوں۔ یہ مجھے گانا سناتی ہے۔ گانے کی بات سن کر قیوم کی امی ہنس پڑیں۔ کہنے لگی گانا نہ گانا، تمھاری بلی تو گونگی ہے۔ قیوم کو اس بات پر بہت غصہ آیا۔ پہلے پھس پھس کی۔ پھر بھیں بھیں رونے لگا۔ گا تو سہم کر کونے میں جا دبکی۔ قیوم کی امی نے کہا، میں تو یونہی کہہ رہی تھی۔ یہ تو بچی بچی بہت اچھی گاتی ہے۔ میں نے بھی سنا ہے اس کا گانا۔ قیوم ایک دم چپ ہو گیا۔ آستین سے آنسو پونچھے اور بولا، ہے نا امی رات کو گاتی ہے نا؟ امی نے کہا، ہاں کیوں نہیں۔ میں نے خود سنا ہے۔ قیوم نے لپک کر گا تو اٹھالی۔ جھولی میں ڈالی اور پیار کرنے لگا۔

ایک شام جب خواجہ صاحب دفتر سے لوٹے تو انھوں نے مریم سے کہا، "آج بیگم صاحبہ دفتر آئی تھیں۔"

"تمھارے دفتر؟" مریم نے بے تعلقی سے کہا: "اپنے خاوند سے ملنے آئی ہوں گی۔"

"تو اور کیا مجھ سے ملنے آئی تھی۔" خواجہ صاحب چارپائی پر دراز ہو گئے اور مریم ان کے پاس پائینتی پر بیٹھ گئی۔ اپنے شوہر کے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولی، "آج روٹی کھائی تھی۔"

"ہاں" شوہر نے آنکھیں بند کر کے کہا، "پلاؤ اور مرغ کا شوربہ انگور اور کیلے کا کسٹرڈ۔"

مریم نے اپنے خاوند کو زور سے جھنجھوڑا اور کہا: "ہائے اللہ میرے ساتھ تو مذاق نہ کرو۔"

"خدا کی قسم!" خواجہ صاحب نے آنکھیں کھول دیں اور پتلون کے پائینچے سے ٹخنہ کھجا کر بولے، "بیگم صاحبہ جو اپنے ساتھ بنگلے پر لے گئی تھیں۔"

"اللہ خیر" مریم نے مسکرانے کی کوشش کی "اتنی مہربانیاں کیوں بھلا؟"

خواجہ صاحب تھوڑی دیر تک چپ رہے پھر بولے، "سنو مریم! بیگم صاحبہ نے گا تو مانگی ہے۔"

"گا تو!" مریم کے منہ سے چیخ نکل گئی "قیوی کی بلی۔"

"ہم اسے کوئی اور دے دیں گے۔ یہ امیروں کے رکھنے کی بلی ہے وہی اس کی ذات کدرات سمجھتے ہیں۔"

"امیر جائیں دوزخ میں۔ میرے لال کی بلی۔ میں تو کسی کو ہاتھ بھی نہ لگانے دوں۔"

خواجہ صاحب نے مریم کی بات پر جان بوجھ کر توجہ نہ دی اور بولے :"پرسوں صاحب نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور کہا، "خواجہ صاحب سنا ہے آپ کے پاس ایک بلی ہے ؟" میں نے جواب دیا، "جی ہاں ہے۔ پوچھنے لگے کیسی ہے ؟ میں نے کہا جی پتہ نہیں۔ چھوٹی سی ہے۔ میرے لڑکے کا ماموں انڈونیشیا سے لایا تھا۔ صاحب نے میز کی دراز سے ایک کتاب نکالی۔ اس میں بلیوں کی ہزاروں تصویریں تھیں۔ مجھے دکھا کر کہنے لگے۔ پہچانو تو تمھارے والی بلی کس سے ملتی ہے۔ میں نے آٹھ دس ورق ہی الٹے ہوں گے کہ کاتو جیسی بلیوں سے پورا ایک صفحہ بھرا ہوا نکل آیا۔ میں نے صاحب سے کہا الٰہی ہے جناب عالی۔ صاحب بہت خوش ہوئے کہنے لگے ہماری بیگم کو بلیوں کا بہت شوق ہے۔ یہ کتاب انھیں کی ہے۔ انھوں نے ہی درخواست کی تھی کہ اگر آپ ازراہِ کرم اپنی بلی ہمیں تحفہ دے دیں گے۔ تو آپ کی نوازش ہوگی۔ یہ سن کر میں شرمندہ سا ہو گیا اور نظریں جھکالیں۔ صاحب نے پھر پوچھا تو میں نے کہا، "صاحب وہ میرے بچے کی بلی ہے اور اسی کے لیے... مگر صاحب نے میری بات پوری نہ سنی اور کہا بچے کا کیا ہے۔ اسے تم کوئی کھلونا ولونا دے کر بہلا لینا۔ کوئی ایسی مشکل بات نہیں بچے وچے بہل ہی جایا کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر صاحب نے مجھے واپس اپنے کمرے میں بھیج دیا اور آج بیگم صاحبہ آگئیں کہ چلو ابھی بلی لا کر دو۔ میں نے کل کی مہلت مانگی ہے۔"

مریم نے یہ ساری بات خوشی سے سن کر کہا، "بیگم صاحبہ ہوگی تو اپنے گھر ہوگی۔ ہم کوئی اس کا دیا ہوا کھاتے ہیں جو بلی دے دیں۔ میرے قیومی کی تو اس میں جان ہے۔"

خواجہ صاحب نے کہا، "اور ہماری جان صاحب کے اختیار میں ہے۔"

"کیوں مریم نے تنک کر پوچھ تو لیا، لیکن فوراً ہی اسے محسوس ہوا اس میں ایسی کون سی مشکل بات تھی جو سمجھ میں نہ آتی۔ مریم رونے لگی تو اس کے خاوند نے اسے سینے کے ساتھ لگالیا اور کہا، "میں کل قیوم کے سکول جانے کے بعد دفتر جاؤں گا اور کاتو کو ساتھ لے جاؤں گا۔ اور بیگم صاحبہ کے بنگلے پر چھوڑ آؤں گا۔ جب قیوم سکول سے آئے گا تو ہم کہہ دیں گے کہ محلے کی آوارہ بلیوں کے ساتھ بھاگ گئی۔"

مریم اپنے خاوند کے کندھے سے لگی روتی رہی اور اس کا سارا وجود سسکیوں سے ہچکولے کھاتا رہا۔

قیوم چوبارے کی چھت پر کھڑا تھا رو رو کر اس کی آنکھیں سوج گئی تھیں۔ کاتو نہ کسی

کوٹھے پر نظر آتی تھی۔ نہ کسی صحن میں۔ اس نے چاروں طرف منہ اٹھا کر آوازیں دیں۔ گاتو۔ گاتو! گاتو گاتو!! پر کوئی بھی نہ بولا۔

قیوم روتا ہوا نیچے اتر آیا۔ اس کی امی نے کہا۔ صدقے جاؤں کیوں ہلکان ہوتا ہے۔ آج گئی ہے کل واپس آجائے گی۔ بلی اپنا گھر نہیں چھوڑتی۔ سال بعد بھی واپس آجاتی ہے۔ نہ آئی تو میں اپنے چاند کو اور لے دوں گی۔ اور کا نام سنا تو قیوم اور زور زور سے رونے لگا۔ چیخیں مارتا نیچے اتر گیا۔ جلد ساز کی دکان پر پہنچا۔ کہنے لگا میری گاتو یہاں تو نہیں آئی؟ دفتری نے کہا اس نے کیا جلد بندھوانی تھی جو یہاں آتی۔ قیوم نے پنساری سے پوچھا۔ شربت والے سے پوچھا۔ قصائی کے تختے نیچے نالی میں ہاتھ پھر کر دیکھا۔ سگریٹ والا بولا: کلرک کا لونڈا گاتو گاتو کر رہا ہے۔ یہاں ٹمیاریں غائب ہو جاتی ہیں۔ یہ بلونگڑے کو رو رہا ہے۔ بڑا ہوگا تو آپ ہی سمجھ جائے گا۔ قیوم کے دوست کہنے لگے چٹی مسجد کے مولوی جی سے لوٹا پھرواتے ہیں۔ وہ چور کی پرچی نکال دیں گے۔ دوستوں کو ساتھ لے کر قیوم روتا روتا مولوی کے پاس پہنچا۔ مولوی کانا تھا۔ اس نے ساری بات سنی۔ ڈاڑھی ہلا کر بولا، پانچ پیسے لاؤ میں لوٹا گھما دوں گا۔ سب نے ایک ایک پیسہ ڈال کر پانچ پیسے جمع کیے۔ مولوی نے لوٹا گھمایا۔ بھنگن کے نام کی پرچی نکلی۔ قیوم غصے میں دیوانہ۔ زور زور سے دھاڑیں مارتا بھنگیوں کے کواٹر پہنچا۔ جاتے ہی اپنی بھنگن سے الجھ گیا۔ اس کی اوڑھنی پھاڑ ڈالی۔ ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ میری گاتو دو۔ میری بلی دو۔ بھنگن نے پرے دھکیلا۔ قیوی نے اس کی کلائی میں کاٹ کھایا۔ بھنگن نے جلدی سے ہاتھ چھڑایا تو گلٹ کا کنگن قیوی کے ماتھے میں لگا۔ خون کی ایک پتلی سی لکیر دوڑنے لگی۔ بھنگی نے روتے ہوئے قیوم کو اٹھایا۔ ان کے گھر لے آیا۔ امی نے دوپٹہ پھاڑ کر پٹی باندھی۔ خواجہ صاحب نے قیوم کو اس حالت میں دیکھا۔ چپ چاپ نیچے اتر گئے۔

جاڑے کا موسم تھا خشک سردی پڑ رہی تھی۔ زمین سے آسمان تک یخ بھری ہوئی تھی اور انسان سے حیوان تک سبھی کانپ رہے تھے۔ قیوم ماتھے پر پٹی باندھے اپنی ماں کے ساتھ بستر میں دبا ہوا تھا۔ اس نے کئی خواب دیکھے۔ جلد ساز کٹائی کے مشین کے نیچے کترنوں میں سے گاتو نکال کر ان کے یہاں دینے آیا تھا۔ گاتو کے گلے میں ہلکی نیلی اور ملگجے لین کی کترنیں الجھی ہوئی تھیں۔ شربت والے نے گاتو گود میں اٹھا رکھی تھی اور اس کی پوستین کے بال صندل اور بزوری سے چپکے ہوئے تھے۔ پنساری کا لڑکا اوپر چوبارے میں بلی لایا تھا اور وہ ساری ہلدی میں

لتھڑی ہوئی تھی۔ بھنگی دروازے پر دستک دے کر کہہ رہا تھا" بی بی جی بلی لے لو جی۔" بھنگی کی اس دستک سے قیوم کی آنکھ کھل گئی اس نے اپنی ماں کا گول گول کندھا پکڑا ہوا تھا اور اس کی ماں اس کے ابا سے کہہ رہی تھی، "اس مرنے جوگی نجر کے اپنے تو اولاد نہ ہوئی۔ دوسروں کے بچوں کا نور نکال کر لے گئی۔"

خواجہ صاحب نے کہا، "لعنت بھیج۔ اس کا نام ہی نہ لے۔ مجھ سے قیوم کے ماتھے پر زخم دیکھا نہ گیا اسی لیے میں نیچے اتر گیا تھا۔" مریم نے کہا، "اللہ کرے اسے ساری عمر بچہ نہ ہو۔ سوکھی بنجر ہی مر جائے خدا کرے۔ میرے لال کو ہلکان کر دیا۔" خواجہ صاحب بولے، "کیا کریں پوزیشن ہی ایسی ہے، صاحب تو کھڑے کھڑے نوکری سے نکال سکتے ہیں۔ اس وقت تو قیوم کی خوشی کو روتے ہیں اس وقت اس کی جان کو رونا پڑے گا۔" "مٹی تمھارے منہ میں۔" مریم نے غصے سے کہا، "نیاز صاحب کوئی ہمارے رازق ہیں۔ روٹی تو اللہ دیتا ہے۔"

"اس نے وسیلے ہی ایسے بنائے ہیں،" خواجہ صاحب نے اپنی بیوی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "اب وہ زمانہ نہیں رہا مریم۔"

اور مریم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا، "اس زمانے نے تو ہماری ہڈیاں پولی کر دی ہیں۔ اللہ کرے نہ رہے یہ زمانہ! میں تو جس دن عید کی ڈالی لے کر گئی تھی اسی دن پتہ لگ گیا تھا کہ کیسی ڈائن ہے تمھاری بیگم صاحب۔ سارا وقت میں تو قیوی پر پڑھ پڑھ کر دم کرتی رہی۔ حبیبِ پاک اس کے دیدوں سے بچائے۔ بچہ خور لگتی ہے۔ اسی لیے تو گودی نہیں بھرتی۔ اب گا تو کو لے کر دودھ پلاتی پھرے۔"

خواجہ صاحب چپ رہے تو مریم نے پوچھا، "جب تم نے اسے گا تو لے جا کر دی تو بہت خوش ہوئی ہو گی۔"

"ہوں۔" خواجہ صاحب نے لاتعلقی سے کہا، "کہنے لگی شکریہ، صاحب سے کوئی کام ہو تو مجھے بتانا۔ میں نے کہا جی اچھا۔ پھر کہنے لگی بس پر آئے ہو؟ میں نے کہا نہیں جی سائیکل پر۔ کہنے لگی اچھا کیا یہاں تو گھنٹہ گھنٹہ بس ملتی ہی نہیں۔ پھر اس نے میری طرف یوں دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو کوئی اور کام تو نہیں؟ اور میں سلام کر کے دفتر آ گیا۔"

"حرامزادی" مریم نے دانت پیس کر کہا، اور کروٹ بدل کر قیوی کے ماتھے پر ہونٹ رکھ دیے۔ گیارہ بج چکے تھے۔ دھند بالکل مٹ گئی تھی۔ دھوپ نکل آئی تھی۔ قیوی بستہ اٹھائے سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ اب اسے سردی نہیں لگتی تھی۔ وہ آج سکول نہیں گیا تھا۔ بس اسٹاپ تلاش